امامیہ مشن کا اکیسواں تبلیغی رسالہ
مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۳۵۳ھ
قیمت ۲ تعداد طبع ایک ہزار خرچ ڈاک ۱

امامیہ مشن بلڈنگ فنڈ

اور

اس کی ضرورت

برادران ایمانی! آپکے اس دینی تبلیغی مشن کے دفتر کیلئے سر دست ایک ہال کی تعمیر مقصود ہے جس کی صرف دو ہزار روپیہ کا صرفہ ہے۔ اس حقیر رقم کا فراہم کردینا دریا دل قوم کیلئے کوئی بڑی بات نہیں ہے صرف توجہ شرط ہے مولا کا نام لیکر اٹھئے اور ہر ہر مقام پر اپنے حلقہ اثر سے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرکے اپنے محبوب مشن کی اس اہم ترین ضرورت کا جلد از جلد انتظام کرادیجئے تاکہ آپکی گاڑھی کمائی کا پیسہ کسی کرایہ کی عمارت پر صرف کرنیکا موقع نہ ملے۔

اس فنڈ میں قلیل سے قلیل رقم بھی شکریہ کیساتھ وصول کیجاویگی اور تمام معطیان کے اسماء و رقوم عطایا کا اخبارات میں اعلان ہوتا رہیگا۔

الداعی الی الخیر
سید ابن حسین عفی عنہ آنریری سکریٹری امامیہ مشن
(لکھنؤ)

فہرست کتاب سبق حسینی

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	امراض اجتماعی	۴
۲	مصلحین روحانی یا مصالحین	۶
۳	حضرت ختمی مرتبت کے تعلیمات، خصوصیات یا مصالحات	۸
۴	اصلاح خلق کے ضروری انتظامات	۱۴
۵	دعوت عمل اور اہمیت کی شخصیت۔ اسباب اطاعت۔ پہلا سبب محبت	۱۷
۶	دوسرا سبب۔ کثرت فضائل	۱۹
۷	تیسرا سبب وابستگی اغراض	۲۰
۸	چوتھا سبب مظلومیت	۲۱
۹	واقعہ کربلا کے عملی نتائج پہلا سبق مظلومیت	۲۲
۱۰	دوسرا سبق جذبہ ہمدردی اور تعاون باہمی	۳۴
۱۱	تیسرا اور سب سے بڑا سبق رواداری و امن پسندی اور جماعت باطل سے علیحدگی	۳۹
۱۲	مظلوم کربلا کے طرز عمل کی حضرت رسول اور علی مرتضیٰ اور حسن مجتبیٰ کے طرز عمل سے مطابقت۔	۴۳
۱۳	رسالتمآب کا طرز عمل۔	۴۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	حدیبیہ کی صلح اور امن پسندی کا مظاہرہ	
۱۴	امیر المومنینؑ کا طرز عمل۔ صفین کی صلح اور رواداری کی اعلیٰ مثال	۷۶
۱۵	امام حسنؑ اور امن پسندی کے ساتھ حمایت حق کا اعلیٰ مظاہرہ۔	۸۶
۱۶	صلحنامہ	۸۸
۱۷	شرائط صلح کی خلاف ورزی	۹۵
۱۸	امام حسینؑ اور رواداری کے اعلیٰ مظاہرات	۱۰۵
۱۹	امیر شام کے نام احتجاجی مکتوب	۱۰۶
۲۰	رواداری کی دوسری مثالیں	۱۰۹
۲۱	طلب بیعت کے وقت رواداری	۱۱۱
۲۲	سفر مکہ	۱۱۵
۲۳	مسلم بن عقیل کی سفارت	۱۲۱
۲۴	روانگی کوفہ	۱۳۲
۲۵	حُر سے ملاقات اور رواداری کے مظاہرات	۱۳۳
۲۶	کربلا میں نزول اجلال اور رواداری کی بہترین مثال۔	۱۴۰
۲۷	عمر سعد سے گفتگو اور صلح کے مظاہرات	۱۴۲
۲۸	فوج کا حملہ اور ایک شب کی مہلت	۱۴۹
۲۹	صبح عاشور اور امام کا خطبہ	۱۵۳
۳۰	حُر کا تاثر اور انجام زندگی	۱۶۲
۳۱	شمر کی سخت کلامی اور امام کی رواداری	۱۶۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۲	زہیر کی تقریر	۱۶۸
۳۳	آغاز جنگ اور امام کا استقلال۔	۱۷۱
۳۴	اصحاب کا استقلال اور جوش وفا	۱۷۵
۳۵	امام کا عظیم ثبات و استقلال	۱۷۷
۳۶	واقعات کا نتیجہ یا سبق کا خلاصہ	۱۸۱
۳۷	چوتھا سبق ۔ بات کی صفائی اور	۱۸۳
	حقیقت کا اعلان	
۳۸	چند مختلف سبق	۲۰۰
۳۹	دشمن کے ساتھ حسن سلوک	۲۰۲
۴۰	دوستوں کے ساتھ برتاؤ	۲۰۴
۴۱	فرائض الٰہیہ کا خیال	۲۰۶

کیا ہم جنت البقیع کو بھول سکتے ہیں؟
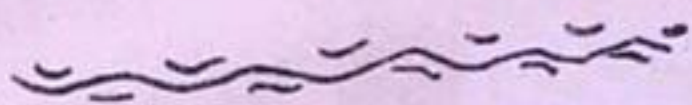
کیا واقعۂ انہدام جنت البقیع فراموش کر دینے کے قابل ہے؟

کیا آپ کے نزدیک جدہ طاہرہ پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کے انسداد کی اب ضرورت باقی نہیں؟

کیا اب آپ کو ظالم اور وحشی نجدیوں کے مظالم کے خلاف کسی احتجاج کی ضرورت باقی نہیں ہے؟

کیا آپ کے نزدیک انہدام جنت البقیع کوئی ایسا معمولی واقعہ ہے کہ اس کے متعلق کسی توجہ کی ضرورت اب آپ محسوس نہیں کرتے؟

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر یہ فرمائیے کہ آئندہ آپ ان روح فرسا مظالم کے انسداد اور تعمیر جنت البقیع کے متعلق کیا ارادے رکھتے ہیں؟

سوگوار جنت البقیع

سید حاجی حسن آنریری اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تحفظ مآثر متبرکہ
حسین آباد۔ لکھنؤ

حضرت فخر المحققین سید العلماء مولانا السید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلہ

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

پہلا ایڈیشن — ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

سید صاحب حسین نجم زادہ

امامیہ مشن لکھنؤ کی اکیسویں تبلیغی خدمت
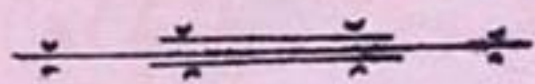
یہ کتاب جو اسوقت ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے اُن دس تقریروں کا مجموعہ ہے جو ۲۱ لغایت ۳۰ صفر ۱۳۵۳ھ مدرستہ الواعظین لکھنؤ میں جناب سید العلماء دام ظلہ نے ارشاد فرمائی تہیں۔

مبارکباد کے مستحق ہیں ہمارے دوست معزز و محترم جناب سید محمد رضا صاحب نصیر آبادی کہ اُنھوں نے عین جلسوں میں اُن تقریروں کو شارٹ ہینڈ کے ذریعہ سے قلبند فرما لیا تھا اور اب جناب مقرر دام ظلہٗ کی نظر ثانی اور اجازت کے بعد ہم اُن کو شایع کرتے ہیں اُمید ہے کہ تمام ارباب نظر اس کتاب کو غور سے ملاحظہ فرمائینگے اور اُس کے نتائج پر سنجیدگی و رواداری سے غور فرمائینگے والسّلام

خادمِ ملت

سید ابن حسین عفی عنہ سکریٹری امامیہ مشن حسین آباد لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین من یومنا ہذا الی یوم الدین

امراض اجتماعی اور اُنکے معالجین

حضرت ختمی مرتبت کی تعلیمات خصوصیات اور اصلاح خلق کیلئے ضروری مطالبات

محبت ذکر فضائل و مناقب بیان مصائب سب کا مقصد دعوت عمل ہے

قال امیر المؤمنین علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیہ فی وصف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طبیب دوار بطبہ قد احکم مراہمہ واحمی مواسمہ یضع من ذلک حیث الحاجۃ الیہ من قلوب عمی

واذان صمّ والسنة بکم متبّع بد وانه مواضع الغفلة ومواطن الحیرة لم یستضیئوا باضواء الحکمة ولم یقدحوا بزناد العلوم الثّاقبة فهم فی ذلك کالانعام السّائمة والصخور القاسیة۔

حضرات! جس طرح انسان کے لئے انفرادی حیثیت سے کچھ امراض ہیں اور بیماریاں جو اُسکی صحت پر اثر ڈالتی اور اکثر ہلاکت کا سبب بنتی ہیں اُسی طرح انسان کی اجماعی زندگی کے لئے کچھ امراض ہیں جو اُسکی قومیّت اور اجتماعی حیثیت کیلئے مضر ہیں اور نتیجہ میں اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

انسان کے انفرادی امراض پر اگر غور کیا جائے تو اُنکی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں، ایک امراض جسمانی دوسرے امراض نفسانی۔ جسمانی امراض جو افرادِ انسان کے جسم پر اثر ڈالتے ہیں اُن کا اثر اُسکی انفرادی زندگی میں محدود رہتا ہے۔ وہ امراض شخص سے تجاوز کر کے نوع تک اور فرد سے آگے بڑھ کر قوم تک نہیں پہونچتے۔

دق ہو یا سل یا کوئی وبائی مرض اور کتنا ہی ہمہ گیر کیوں نہو یہاں تک کہ کوئی فرد اُس سے مستثنیٰ نہ رہے لیکن پھر بھی وہ مرض افراد کا مرض ہے اُسے قوم کا مرض کہنا صحیح نہیں ہے۔

کیوں؟ اسلئے کہ قوم کی بنا قومیت پر ہے اور قومیت کی بنیاد انسان کے

جسمانی اتصال و اتحاد پر نہیں ہے اس لئے مشرق و مغرب کے انتہائی دو
نقطوں پر بسنے والے دو شخص قومیت میں متحد ہو سکتے ہیں حالانکہ جسمانی
حیثیت سے انمیں ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے اور ہمہ وقت پاس رہنے
اور اُٹھنے بیٹھنے والے قومیت میں مختلف ہو سکتے ہیں باوجودیکہ اُنکا جسمانی
اتصال حد سے زیادہ ہے۔

اس لئے اگر افراد قوم کا جسم بیمار ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اُس کا اثر قومیت
کے اوپر پڑے اور قومیت کی بنیادیں کمزور ہو کر قوم کی بیماری کا ذریعہ قرار پائیں
لیکن افراد کے نفسانی امراض وہ ہیں جو قوم کی بیماری کا سبب ہوتے ہیں
اسلئے کہ قومیت کی بنیاد روحی اجتماع اور نفسانی ارتباط پر ہے۔ یہ اجتماع
وارتباط اُس وقت تک مکمل صورت سے باقی رہیگا جب تک افراد قوم
کا مزاج نفسی حد اعتدال سے خارج نہیں ہوا ہے لیکن ادہر نفوس کی حالت
خراب ہوئی۔ انمیں بیماریاں ہوئیں اُدہر نفوس کی باہمی کشش آویزش وارتباط
میں کمزوری پیدا ہوئی اور قومیت کے شیرازہ میں انتشار ہوا۔ تعاون باہمی
مفقود ہوا۔ ہمدردی کے جذبات فنا ہوئے۔ خود غرضی، حسد، عداوت،
تعصب، ہٹ دہرمی کے جراثیم نے قومی جسم کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع
کیا اور نتیجہ میں قوم فنا ہو کر رہ گئی اگرچہ افراد اُسکے انفرادی حیثیت سے زندہ
موجود ہوں ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

بے شک نفسانی حالتوں کا تغیر وہی ہوتا ہے جو قوم کی حالت میں بحیثیت قوم تغیر پیدا کر دیتا ہے اور قوم قوم باقی نہیں رہتی۔

یقیناً جس طرح شخصی امراض کیلئے اطبائے جسمانی کی ضرورت ہے جو مرض کی صحیح تشخیص کے ساتھ اُسکے معالجہ کی طرف متوجہ ہوں اُسی طرح قومی امراض کیلئے مصلحین روحانی کی ضرورت ہے جو اپنی صائب نظر سے بیماریوں کی تشخیص کر کے مزاج نوعی کی اصلاح کریں اور اپنے کامیاب علاج سے قوم کے صحت کی ذمہ داری لیں۔

بے شک خدائے مہیمن و حکیم نے جو انسان کی تربیت و تعلیم کا واحد ذمہ دار ہے دنیا کو ایسے روحانی مصلحین سے خالی نہیں چھوڑا اور انبیاء و مرسلین کا لگاتار سلسلہ اسی لئے قائم کیا کہ وہ نوع بشری کی اصلاح و تربیت کے فرض کو مکمل طریقہ سے انجام دیں اور اُن امراض کا علاج کرتے ہوئے جو مزاج اجتماعی کیلئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں وہ نظام بشری کو صحت و اعتدال کے اوپر برقرار رکھیں۔

نظام انسانی کے واحد نبض شناس قادر و حکیم اللہ کی طرف سے جو مصلح بھی مقرر ہوں وہ بے شک اپنے اپنے زمانہ کے لئے پورے طور سے کامل و اکمل اور مزاج اجتماعی کے مطابق ہی ہونگے۔ اُن کے نسخوں میں بھول چوک غلطی اور خطا کا امکان نہیں ہے اور اس حیثیت سے وہ سب اپنے اپنے وقت کے لئے

بہترین طبیب اور کامل واکمل مصلح ہیں لیکن پھر بھی اُن میں حذاقت اور کمال کے اعتبار سے مدارج قائم ہیں جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

تلک الرسل فضلنا بعضہم علےٰ البعض

بعض کی نبض شناسی ایک قریہ ایک جماعت تک محدود اور بعض کی ایک ملک ایک صوبہ اور بعض کی تمام دنیا مگر اپنی زندگی کے دور کے ساتھ محدود تھی اور بعض اپنے قانون وشریعت کے اعتبار سے صدیوں تک کے معالج ہوئے بایں معنی کہ اُن کے نسخے چند صدی تک جو مزاج انسانی میں انقلابات پیدا ہونیوالے تھے سب کی مراعات سے طیّار کئے گئے تھے لہذا اُس مدّت تک وہ بکار آمد لیکن اُسکے بعد بے کار ہوجانیوالے تھے۔

یقیناً یہ مختلف مراتب انسان کو ایک کامل ترین معالج کی طرف ضرور متوجہ کرتے ہیں جسکے بتائے ہوئے مجربات وتعلیمات ایک قرن ایک صدی، ایک نسل کے حالات اور مزاجی انقلابات کے ساتھہ مخصوص نہوں بلکہ عالم امکان میں انسانی مزاج کے اندر جتنے انقلابات ہونیوالے ہیں اور حالات میں جتنی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اُن سب کے اعتبار سے طیّار کئے گئے ہوں اور اس لئے وہ کسیوقت میں بیکار ثابت نہوں بیشک ایسا طبیب وہ ہوگا جو عالم کا آخری مصلح قرار پا سکے اور اُس کا قانون وہ ہوگا جو دوام وبقا کی سند کا مالک ہو اور اُسکے بعد کسی مستقل مصلح کی ضرورت نہوگی۔

یہی مصلح ہے خاتم النبیین، یہی ہے افضل المرسلین اور اسی کی تعلیمات ہیں شریعت اسلامیہ جو ہمیشہ ہمیشہ قائم و برقرار اور نا قابل تغیر و تبدیل ہے۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین اُسکے مصلح خاتم ہونے کی سند اور لانبیّ بعدی کی آواز اُسکے طبیب آخر ہونے کا اعلان اور لیظہرہ علی الدّین کلّہ کا وعدہ اُسکے غلبہ و دوام کی ضمانت ہے۔

بے شک حضرت رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دور میں مصلح عالم بشریت اور طبیب نفوس خلق قرار دیے گئے تھے۔

دنیا کے طبیب اپنے مریضوں کے اُتنے ہمدرد نہیں ہوتے جتنے خدا کے فرستادہ روحانی طبیب، دنیا کے اطبّاء مریضوں کے علاج کے لئے اسکے منتظر رہتے ہیں کہ مریض اُنکی طرف رجوع کریں اُن سے اپنا حال کہیں۔ علاج کی خواہش کریں تب وہ علاج کریں۔ وہ اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ "کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے"۔

لیکن یہ اُسی وقت ہے کہ جبتک طبیب کا مریض کیساتھ تعلق اُسی حد تک محدود ہے کہ وہ طبیب ہے یہ مریض۔ لیکن اگر طبیب کا مریض کیساتھ تعلق کچھ ایسا ہو گیا کہ مریض کے حالات کی نگرانی اُسکی اصلاح و تربیت، زندگی، نشو و نما کی ذمہ داری طبیب پر عائد ہو گئی جیسے باپ کا تعلق بیٹے کے ساتھ تو اب صورت حال مختلف

ہو جاتی ہے۔

باپ طبیب اور بیٹا مریض یہاں وہ صورت نہ ہوگی کہ بیٹا حال کہے۔ خواہشمند ہو تب باپ اُسکے علاج کی طرف متوجہ ہو بلکہ یہاں بیٹے کو خبر بھی نہیں۔ وہ اپنی غفلت وسہل انگاری سے اپنے انحراف مزاج اور طبیعت کے سوءِ اعتدال سے مطلع بھی نہیں لیکن باپکے دل کو لگی ہوئی ہے۔ وہ اُسکی حالت کا نگران ہے اور جب ضرورت محسوس ہوتی ہے خود سے حفظان صحت کی ہدایتیں کرتا اور مرض سے تحفظ کی تدبیریں بتلاتا ہے اور یہ چاہتا ہے۔ کہ کسی طرح اُس کا مزاج صحیح وسالم اور ہر طرح کے مرض اور بیماری سے علیحدہ ہو جائے۔

رسالتمآبؐ طبیب روحانی تھے اور خدا کی طرف سے مصلح خلق بنا کر بھیجے گئے تھے اسلئے اُن کے تجویز کردہ معالجات میں غلطی، بھول چوک کا امکان نہ تھا اسکے ساتھ آپ رحمۃ للعالمین تھے اور رب العالمین کی طرف سے مربی خلق مقرر کر کے بھیجے گئے تھے اور خالق ومخلوق کے درمیان واسطہ فیض سرمدی تھے اسلئے آپ کا رشتۂ الفت مخلوق الٰہی کیساتھ اُس سے بھی زیادہ تھا جتنا ایک باپ کو اپنی اولاد کیساتھ ہوتا ہے اور اسی رشتۂ محبت کو عام افراد کے معیار فہم کے مطابق واضح کرنے کے لئے رسالتمآبؐ نے فرما دیا تھا "انا وعلیؑ ابوا ھذہ الامۃ" میں اور علیؑ دو باپ ہیں اس اُمت کے"

اور رسولؐ کی ابوت جو مثل ہر صفت کے اکملیت کا درجہ رکھتی تھی اُس کے

نتائج تو اس قدر نمایاں ہوئے کہ احکام شرعی میں اُنکا مظاہرہ ہوا اور رسولؐ کے ازواج امہات المومنین قرار دیکر تمام خلق کے لئے ہمیشہ کیلئے حرام قرار دیئے گئے۔ النبی اولی بالمومنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم۔ وما کان لکم ان توذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا

اس رشتۂ الفت کا تقاضا تھا کہ آپ کی ہمدردیاں نوع انسانی کیساتھ انتہائی درجہ پر پائی جائیں اور نہ صرف اُس طرح جیسے طبیب اپنے مریض کا علاج کرتا ہے آپ اپنے مریضوں کی خواہش پر اُن کے علاج کی طرف توجہ فرمائیں بلکہ اُس ذاتی ذمہ داری کی بنا پر جو آپ اپنے اوپر عائد سمجھتے تھے آپ خود گردش کر کے مریضوں کی تلاش کریں اور بیماروں کی جستجو میں پھیری لگا کر بیماروں کا پتہ چلائیں اور ہر وقت علاج کا سامان ادویہ آلات وغیرہ اپنے ساتھ رکھیں تاکہ کسی ضرورت کے موقع پر تھوڑی بھی تاخیر ہونے نہ پائے اسلئے آپ کے وصف میں آپکے مراتب کمال کے بہترین واقف کار امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السّلام وہ الفاظ ارشاد فرماتے ہیں جنکو میں نے اپنے کلام کا سرنامہ قرار دیتے ہوئے شروع کیا ہے۔ طبیب دوار بطبہ قد احکم مراهمہ واحمی مواسمہ

"وہ معالج تھے کہ جو اپنی داؤں سمیت گردش کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرھموں کو طیار کر رکھا تھا اور داغنے کے آلات ہر وقت گرم رکھتے تھے"۔

یضع من ذلک حیث الحاجۃ الیہ من قلوب عمی واذان صم و

السنة بکم" وہ اپنے معالجات کو عمل میں لاتے تھے جہاں اُنکی ضرورت محسوس ہوتی تھی ایسے دلوں میں سے جو بصارت سے بے بہرہ اور ایسے کانوں میں سے جو سامعہ سے محروم اور ایسی زبانوں میں کہ جو گویائی سے دور ہیں"

متبع بدوائہ مواضع الغفلۃ ومواطن الحیرۃ "وہ جستجو کے ساتھ اپنی دواؤں کو پہونچانیوالے تھے غفلت و بیخبری کے مقامات اور حیرت و سرگشتگی کے مرکزوں تک لیکن عام افراد بشر کی یہ حالت تھی کہ پھر بھی اُنہوں نے بد پرہیزیاں کیں اور آپکے معالجات سے اثر پذیر نہوئے لم یستضیئوا باضواء الحکمۃ ولم یقدحوا بزناد العلوم الثاقبۃ "اُنھوں نے حکمت کی ضیاؤں سے مستفید ہونا نہیں چاہا اور روشن علمی چقماغوں سے کسب ضیا نہیں کیا۔ فھم فی ذالک کالانعام السائمۃ والصخور القاسیۃ" وہ اِس بات میں چرنے والے چوپایوں اور سخت پتھروں کے مثل ہیں کہ اُن پر مواعظ و ہدایات کا اثر نہیں ہوتا"

درحقیقت ایک طبیب کے اوپر یہ ذمہ داری عائد نہیں کیجا سکتی کہ جتنے مبتلائے مرض اور بیمار ہیں سب ضرور شفایاب ہو ہی جائیں بلکہ ایک طبیب کی کامیابی اتنی ہی ہے کہ وہ ایک مکمل اور صحیح طریقۂ علاج پیش کر دے اور ایسے ہدایات کر دے کہ جو شخص اُن ہدایات پر عمل کرے اور اُس طریقہ علاج پر کاربند ہو وہ ضرور اپنے مرض سے شفایاب ہو جائے۔

عمل نہ کرنے میں مرض کا باقی رہنا اپنی کوتاہی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے جس کی ذمہ داری معالج پر عائد نہیں ہوتی۔ رسالتمآبؐ طبیب روحانی تھے اور انہوں نے ایک مکمل نسخہ قانون شفا کا دنیا کے سامنے پیش کیا جس کا نام ہے قرآن۔ ارشاد ہوتا ہے وننزل من القرآن ما ھو شفآءٌ و رحمۃ للمؤمنین۔

بے شک یہ کتاب (قانون) کافی و وافی ہے اور جو شخص اُس پر عمل کرے اُسکے نجات و شفاء کی ذمہ دار لیکن عمل علم پر موقوف ہے۔
اور علم کیلئے رموز شناسی اور واقفیت اسرار کی ضرورت۔
حاذق اطباء کے نسخے اپنے موقع کے لئے مفید اور نتیجہ خیز سہی مگر اسی وقت جب وہ کسی طبیب کے ہاتھ میں ہوں جو ذاتی حیثیت سے انکی ساخت ترکیب مقدار اجزاء، موقع و محل کا ماہر اور مطلع ہو لیکن بڑی مکمل ترین کتاب معالجات کسی اناڑی کے ہاتھ میں پہونچے اور وہ اُس سے کام لینا چاہے تو یاد رہے کہ نسخوں کا اثر رخصت اور بڑے سے بڑے کامیاب معالجات بے اثر ہو جائینگے۔ یہ کتاب کا نقص نہیں بلکہ طریقۂ استعمال کی بے ترکیبی کا نتیجہ ہے۔

ایسی صورت سے قرآن حکیم بیشک وہ انسانی ضروریات کے لئے کافی اور نظام بشری کے تمام جزو و کل پر حاوی ہے ولا رطب ولا یابس

الا فی کتاب مبین لیکن اُسکے لئے حامل کی ضرورت ہے اور ایک ایسے شخص کی حاجت ہے جس کی عملی تربیت اُن ہی تعلیمات کے سایہ میں اتنے مکمل طریقہ پر ہو چکی ہو کہ اُسکی زندگی اُنہی تعلیمات کا مکمل آئینہ بنی ہوئی ہو۔ وہ قرآنی ہدایات کا معلم ہو مگر اپنے عملی نمونہ کیساتھ اور اس طرح وہ معالجہ و اصلاح خلق کے فرض کو انجام دے۔

یقیناً رسالتمآبؐ اپنے زمانہ میں بہترین نمونۂ عمل تھے اور قرآن کی تعلیم کیساتھ وہ اپنے عمل کا بہترین نمونہ پیش کر کے دنیا کی اصلاح کا فرض ادا کر رہے تھے اسی لئے ارشاد ہوا ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ "تمہارے لئے رسالتمآبؐ کی سیرت میں بہترین نمونۂ عمل ہے"

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

" اگر محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو عمل سے میرا اتباع کرو کہ خدا کے بھی محبوب ہو جاؤ"

رسالتمآبؐ کی بشری زندگی محدود تھی اور وہ ایک محدود زمانہ میں ختم ہو گئی۔ قرآن مجید کتاب محکم، قانون شفا، ہدایت خلق کے لئے موجود لیکن نمونۂ عمل کی ضرورت۔ یعنے جس طرح رسولؐ اپنے زمانہ میں اپنی عملی تعلیم سے دنیا کو عامل بالقرآن بناتے تھے اُسی طرح آپ کے بعد بھی ضرورت ہے ایسے اشخاص کی جو قرآن کی تعلیم کے ساتھ اخلاق و کمالات میں رسولؐ

کے جانشین اور آپ کی طرح دنیا کے لئے نمونۂ عمل بننے کے قابل ہوں۔ جنکی عملی سیرت کا اتباع بعد سیرت رسولؐ نجات و فلاح کا ذمہ دار ہو اور اس طرح وہ قرآن کے ساتھ اور قرآن اُن کے ساتھ ہو۔ اُن کے اتبّاع سے قرآن کا حقیقی اتباع اور قرآن کے اوپر عمل کرنے سے اُن کے دامن سے تمسک ہوتا ہو یعنے کسی طرح ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے۔ اسی کے بتانے کے لئے رسولؐ نے اپنی وہ مشہور حدیث ارشاد فرمائی کہ انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھلبیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلّوا بعدی انھما لن یفترقا حتیٰ یردا علیّ الحوض۔

بیشک یہ وہ افراد تھے جنکو رسالتمآبؐ نے اپنے بعد کیلئے دنیا میں نمونۂ عمل قرار دیا تھا اور یہ منظور تھا کہ دنیا اپنی عملی زندگی میں اُنکی پیشوائی کو قبول کر کے اُن کے نقش قدم پر گامزن ہو اور اس طرح کامیابی کے حقیقی نقطۂ ارتقاء پر فائز ہو۔

فرض کے طور پر کسی پابندی کا عائد ہونا اور کسی کے اتباع و اطاعت کا اپنے اوپر لازم و واجب سمجھنا یہ ایک ایسی چیز ہے جو افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے انسانی طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

وہ کتنی ھی مفید و نتیجہ بخش بات کو یہ سمجھ کر کہ مجھے چار و ناچار اسے کرنا ہے بجا لاتے ہوئے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اور اس لئے قہر و غلبہ۔ رعب و ہیبت

سے جاری شدہ قوانین کتنے ہی زیادہ طاقت کیساتھ جاری ہوں لیکن اُنکا اجرا رچونکہ سلطنتی اقتدار کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اُن کے لئے بقا و دوام کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔

قانونی قیود کی جکڑ بند اُسی وقت تک انسان کے دست و پا کو روک سکتی ہے جب تک اُسکی گرفت مضبوط ہو اور ادہر شکنجہ میں کمزوری اور گرفت میں سستی پیدا ہوئی اُدہر دل کی اُمنگ اُس کے توڑ دینے کے لئے طیار ہو گئی۔

پھر ظاہری نظام سلطنت کتنا ہی مکمل سہی لیکن وہ ظاہری اسباب و ذرایع کا محتاج ہے اسلئے جہاں تک جاسوسوں کا خطرہ۔ مخبروں کا کھٹکا قانونی زد میں آنے کا خوف ہو وہاں تک قانون کی پابندی ہے اور ادہر تنہائی کا موقع۔ خبر رسی سے اطمینان ہُوا، کوئی روک باقی نہ رہی انسان آزاد ہے اور بالکل آزاد اور اُس کیلئے کوئی قانون کا خیال دامنگیر نہیں ہے

یہی چیز وہ ہے جہاں سے انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے مذہب کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔

مذہب کا اقتدار ظاہری اقتدار نہیں جو شان و شوکت کا محتاج ہو۔ جس میں جاسوسوں، مخبروں کا کھٹکا، اور اُنکی خبر رسانی کا اندیشہ ہو۔ مذہب دلوں کی حکومت اور ضمیر کی بادشاہی ہے۔ اُس وقت جب دنیا کی آنکھیں محو خواب، شب کی تاریکی کا سناٹا، چار دیواری کا احاطہ اور پردوں کا

حجاب ہو، جب کوئی موجود نہو۔ جب جاسوسوں اور مخبروں کا وہم وگمان نہو اُسوقت انسان کی زندگی کو خلاف آئین باتوں سے بچانیوالا مذہب ہوتا ہے اور بس فرض مذہبی کا احساس۔

یہ فرض کا احساس انسان کو پابند ضرور بنا دیتا ہے مگر طبیعت کے اوپر کی گرانی نہیں جاتی۔ کتنا ہی مطیع فرزند ہو۔ باپ کے حکم کی مخالفت جرم سمجھتا ہو۔ کسی پیش نظر مقصد سے باپ کے حکم کی بنا پر کنارہ کشی بھی کرلے لیکن طبیعت پر گراں نہ گذرے یہ ناممکن ہے۔

اس صورت میں اطاعت کا مقصد حاصل تو ہوجاتا ہے مگر ناخوشگواری وگرانی کی بنا پر انسانی طبیعت کو اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر ضرور رہتی ہے اور اسلئے کمزور طبائع کے لوگ خواہش کے مقابلہ میں فرض شناسی کو چھوڑکے معصیت کے مرتکب بھی ہوجاتے ہیں۔

لیکن اگر یہی فرض کی پابندی کسی طبعی نظام کے تحت میں آکر انسانی خواہش کے مطابق بنجائے اور انسان کی فطرت کے اعتبار سے اُسکے مناسب طبع و مذاق ہوجائے تو پھر وہ فرض ایک خوشگوار ذاتی خواہش کے لباس میں آکر انسان کے لئے بار طبع باقی نہیں رہتا اور انسان اُسے خوشی خوشی بشاش چہرہ و بشرہ کیساتھ بجالانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

بیشک رسولؐ اسلام حکیم روحانی تھے اور نفسانی افتاد طبع اور اُسکے خصوصیات

سے پورے طور پر مطلع - اُنہیں اپنے بعد کے لئے کچھ افراد کو نمونۂ عمل بنانا تھا اور اُن کے اتباع و اطاعت کو فرض قرار دینا تھا لہذا اُنہیں اسباب تلاش کرنے کی ضرورت تھی جو ایک انسان کیطرف لوگوں کے جذب قلب کا باعث اور اسکے افعال و اقوال کو مرکز توجہ بنا کر انکے اتباع و اقتدار کیطرف متوجہ کرنے والے ہیں۔

رسالتمآبؐ نے ایسے وجوہ و اسباب کی تلاش کی جن سے ایک انسان کی پیروی اور متابعت کیطرف دلوں کو توجہ پیدا ہوتی ہے اور آپ نے وہ تمام اسباب اپنے اہلبیت کیلئے مجتمع فرمادئے۔

پہلا سبب ایک انسان کی طرف جذب کا ہے محبت - بڑے سے بڑا کام جو طبیعت پر گراں گذرتا ہو محبت کے واسطے سے لیا جائے تو وہ آسان معلوم ہوگا - انسان جس سے محبت کرتا ہے اسکی باتوں کو ماننا اور اسکے اقوال پر عمل پیرا ہوتا ہے اُس سے محبت کرتا ہے تو اُس کے افعال سے بھی محبت کرتا ہے اور خود اُن کے اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

رسالتمآبؐ نے اپنے اہلبیت کیلئے اس پہلو کو انتہائی تقویت دی اور مختلف طرح سے دنیا کو اپنے اہلبیت کی محبت پر آمادہ کیا۔

خود محبت کا اظہار کیا اور ایسا کہ جس کی نظیر ملنا ممکن نہیں - خدا کی محبت کا اعلان کیا اور ہر طرح قول سے، عمل سے، قرآن سے آثار سے اسکو نمایاں فرمایا پھر مسلمانوں کو محبت کی دعوت - اُنکی محبت اجر رسالت، اُنکی محبت شرط ایمان و اطاعت، اُنکی محبت معیار فلاح و نجات۔

غرض ہر طرح اُنکی محبّت کی اہمیت کو دنیائے اسلام کے سامنے واضح و روشن کیا۔

میرا سوال ہے مسلمانوں سے اور صبر و سکون کے لمحوں میں غور کرنے کی خواہش ہے کہ آخر رسالتمآبؐ کا اس قدر اظہار مودّت اور تاکید محبت اپنے مخصوص اہلبیت اور عترت طاہرین کیساتھ معنی کیا رکھتا ہے؟

کیا یہ سب کچھ صرف اس بنا پر تھا کہ وہ آپکے اہلبیت تھے یعنے آپ کی بیٹی تھیں۔ آپ کے داماد تھے آپکے نواسے تھے۔ آپ کی اولاد تھی اسلئے آپ کو شاں تھے کہ دنیا انکی گرویدۂ محبت ہو جائے؟ یہ تو رسولؐ کی کوئی اچھی تصویر نہیں ہے۔

آپ دنیا میں مبلغ شرع اور مصلح خلق بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ دنیا کو اُن باتوں کی ہدایت کریں جو اُن کے فلاح و نجاح کی ضامن ہوں اور اُنکی زندگی کے مہذّب و شائستہ بنانے میں دخیل ہوں اس لئے آنحضرتؐ اپنی منتسبین اور اپنے اعزا کے رسوخ و اقتدار کو بڑھانا، اُنکی طرف لوگوں کے قلوب کو متوجہ کرنا اور دنیا کو اُنکا گرویدہ بنانا صرف اسلئے کہ وہ آپ کے عزیز ہیں، رشتہ دار ہیں۔ نفس پروری خود غرضی، جانبداری کا ایک برا مظاہرہ ہوگا جو کسی طرح شان رسولؐ کے لائق نہیں ہے۔

میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ رسالتمآبؐ کا ان لوگوں کی محبت و الفت کی تبلیغ میں اس قدر اہتمام کرنا اسی لئے تھا کہ وہ ان کو مقتدائے خلق اور عملی

تعلیمات کا نمونہ بنانا چاہتے تھے اسلئے اُنکی ہر دلعزیزی میں اس قدر کوشش
واہتمام میں منہمک تھے۔ آپ نے محبت کا بیج بویا تھا اسلئے کہ اُس سے
نہال اطاعت بارآور ہو۔
دوسرا سبب ہے کثرت فضائل۔ ایک انسان جس کی عظمت اُس کے
مختلف ذاتی خصوصیات و کمالات کے اعتبار سے انسان کے ذہن نشین
ہو چکی ہو اُسکے افعال و اعمال کو انسان بہت غائر نظر سے دیکھتا اور اُنپر
عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
رسالتمآبؐ نے اپنے اہلبیت کیلئے اس خصوصیت کو بھی انتہائی معراج کمال
پر پہونچا دیا اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ ان حضرات کے بیان فضائل میں صرف
کیا۔ میں یہ نہیں کہرا ہوں کہ وہ فضائل تھے نہیں اور بمصلحت بیان کئے گئے
میں کہتا ہوں کہ وہ فضائل تھے مگر اُن کے بیان کرنے میں اس قدر اہتمام
کی ضرورت کیا تھی؟
اگر اُن کی شخصیتوں کو کوئی ذمہ دارانہ حیثیت دنیا منظور نہ تھا، اگر
اُنہیں عام رعیت سے بلند کر کے کسی خاص درجہ تک پہونچانا مقصود نہ تھا تو
اُنکی شخصیتوں کو اِس امتیازی شان سے دنیا میں روشناس کرانے کا کیا
مقصد تھا اور اُن کے فضائل اس شد و مد سے بیان کرنے کی حاجت کیا تھی؟
میرے نزدیک یہ فضائل کا بیان بھی اسی مقصد کا پیش خیمہ ہے کہ انہیں

مربی خلق اور نمونۂ عمل قرار دینا تھا لہذا اُن کے کمالات کو بیش از بیش صورت پر واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرا سبب کسی شخص سے اغراض کا وابستہ ہونا، یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کے لئے دوسرے کی طرف جذب ہونے کا باعث اور اُسکے افعال و اقوال کی اقتداء کا ذریعہ ہوتی ہے۔

رسولؐ نے اِس خصوصیت کو بھی اپنے اہلبیت کے لئے نظر انداز نہیں کیا مسلمانوں کی نظر میں بے شک دنیا سے زیادہ آخرت کا سوال مقدم ہے اس لئے دنیا کے نہیں آخرت کے اغراض اہلبیتؑ سے وابستہ قرار دیے گئے۔ اور ساقیٔ کوثر حامل لواء، قاسم جنت و نار، شافع خلق وغیرہ الفاظ کے ساتھ اُن کے روحانی اقتدار کا سکہ قائم کیا گیا۔ اِس سے بھی یہی منظور تھا کہ دنیا ان توقعات کی بنا پر بھی اطاعت واتباع پر آمادہ ہوسکے۔ اسلئے کہ کسی سے اعانت، امداد، سفارش کی توقع اُسی وقت حق بجانب ہوتی ہے جب انسان اُسکے مسلک کا سالک، اُس کے افعال و اقوال کا پیرو بھی ہو۔ انعامات کیلئے جس طرح استحقاق کی ضرورت ہے اُسی طرح مراعات بھی ایک جہت استحقاق پر مبنی ہوتی ہے۔ مراحم خسروانہ کے سلسلہ میں آزادیاں ہوتی ہیں لیکن جرائم پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ بعض جرائم اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ مراحم خسروانہ کے تحت میں بھی عفو کے قابل نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مراحم خسروانہ میں بھی استحقاق

کو دخل ہے۔

شفاعت۔ سقایت کوثر وغیرہ تمام چیزیں ہیں لیکن اُنہی لوگوں کے لئے جو استحقاق رکھتے ہوں۔ اُن کے لئے نہیں جن کے اعمال دیکھکر خود شفیع اکرم کو شرم آجائے اور وہ شفاعت سے کنارہ کشی کرے۔ اسلئے بہر حال اتباع کی ضرورت ہے تاکہ شفعاء سے آنکھیں چار کرنے کا موقع رہے پھر انسانی کمزوریوں سے اگر کچھ فروگذاشتیں رہجائیں تو اُسکے لئے شفاعت و مغفرت الٰہی کی توقع رکھنا بیجا نہیں ہے۔

چوتھا سبب ہے مظلومیت۔ یقیناً مظلوم کی طرف دنیا کا دل کھنچتا اور اُسکے افعال و اقوال کیساتھ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس سے بھی اطاعت و اتباع کے مقصد کو تقویت پہونچتی ہے۔

یہ صفت بھی اہلبیت رسولؐ میں انتہائے حد کمال کیساتھ پائی گئی اور جیسی مظلومیت کی مثالیں اُنمیں نظر کے سامنے آئی ہیں دنیا اُنکی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔
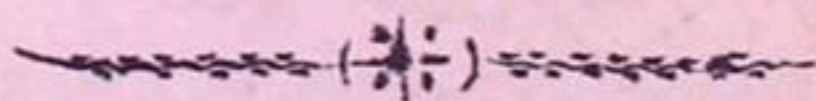
بیان مذکور الصدر کے آخری اجزاء کو غائر نظر سے مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ دنیائے فضائل و مناقب اور دنیائے مصائب دونوں میں ایک ھی روح ہے جو مضمر ہے اور وہ دعوت عمل ہے جس سے اصلاح خلق کا

مقصد انجام پذیر ہوتا ہے لیکن یہ جبھی ہے کہ جب اہلبیت کے واقعات کو اس نظر سے دیکھا بھی جائے کہ اُن سے کون سے سبق حاصل ہوتے ہیں اور انسان کی عملی زندگی کے لئے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر ان واقعات اور اہلبیت کے کارنامہ ہائے حیات میں سے عظیم ترین اور اہم کارنامہ یعنے واقعۂ کربلا میرے سامنے ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسکے عظیم الشان عملی نتائج کے متعلق وقت کی مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار کروں واللہ المستعان وھو ولی الامور

واقعۂ کربلا کے عملی نتائج

پہلا سبق

مظلومیت

یعنی

حق کے راستے میں مصائب کا تحمل

کربلا کے واقعہ کے تفصیلی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے اجمالی حیثیت سے جو بڑا نتیجہ اُس سے برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک انسان کو سچائی اور حقانیت

کے راستے میں کس حد تک مصائب کے برداشت پر طیار ہونا چاہیئے اور کس طرح
ایک اصول کی حمایت میں جس کو سچا سمجھ لیا ہے ضرورت کے وقت اپنی جان
اور اپنی ہر عزیز ترین چیز کو نثار کر دینے میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

ایک مذہب کی سچائی کی بڑی علامت ہے اُس مذہب کے بانیان کا ثبات
قدم اور استقلال کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور باوجود اسکے آخر وقت
تک اپنے اصول سے منحرف نہونا۔

کسی مذہب کے عقیدت کیشوں میں عام افراد کا مصائب کو جھیل لینا یا اپنے
تئیں قربانی کے لئے پیش کرنا کوئی ایسا مستند امر نہیں ہے اسلئے کہ عام افراد
اکثر حقیقت حال سے بیخبر اور واقعی دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔
اُنمیں بہت ممکن ہے کہ وہ سراب کو آب اور مجاز کو حقیقت خیال کریں اور اپنے
مزعوم باطل کی حمایت میں جان دینے پر بھی طیار ہو جائیں لیکن خود بانی مذہب اور
اُسکے مخصوص واقف کار افراد اور گھر والے لوگوں کا جو اُس کے اسرار زندگی
اور رموز حیات اور معیار اخلاق و اوصاف سے پورے طور پر واقف ہیں انکا
اصول کی حمایت میں استقلال و ثبات قدم کے ساتھ مصائب کو برداشت
کرنا اور ضرورت کے وقت جان کی قربانی پیش کرنا یہ بے شک دلیل ہوگا
کہ اس اصول میں سچائی اور اخلاص کا جوہر مضمر ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کسی انگریز کے کلام میں دیکھا تھا کہ حضرت محمد مصطفٰے

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ پر سب سے پہلی ایمان لانے والی آپ کی بیوی اور دوسرے ایمان لانے والے آپ کے چچا زاد بھائی تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اخلاق و کمالات اور ذاتی اوصاف اپنی خانگی زندگی اور شخصی افعال واعمال میں بھی ایسے تھے جو آپ کی روحانیت کا سکہ قائم کریں اور آپ کی نبوت اور رسالت کے تسلیم کرنے کی اجازت دیں۔

یہ نکتہ ایسا تھا جو نصارائے نجران کے بھی پیش نظر تھا جب وہ مباہلہ کیلئے طیار ہو کر آئے ہیں تو اُن کے بڑے اسقف نے کہا تھا کہ دیکھو اگر محمد (ص) اپنے عزیزوں اور گھرانے والوں کو لیکر میدان مباہلہ میں آئیں تو کبھی مباہلہ نہ کرنا کیونکہ اسکے معنی یہ ہونگے کہ اُنہیں اپنی سچائی پر پورا بھروسا ہے اور اسلئے وہ اتنے سخت موقع پر بھی اپنے عزیزوں اور دل کے ٹکڑوں کو علیحدہ نہیں کرتے اور اگر وہ اپنے ملنے والے اصحاب یعنے غیروں کو ساتھ لیکر آئیں تو مباہلہ کر لینا۔ اس سے ثابت ہوگا کہ وہ دوسروں کو اول دیکر اپنے خاص لوگوں کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔

اور اسی لئے جب حضرت صلعم اپنی پارۂ جگر فاطمہ زہراؑ، اپنے ابن عم علیؑ بن ابیطالبؑ اپنے فرزندان حسنؑ حسینؑ کو لیکر آئے اور نصاریٰ کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینے پر طیار ہو گئے۔

جناب رسالتمآبؐ کا طرز عمل اپنی لڑائیوں میں بھی یہی تھا کہ وہ اپنے عزیزوں

کو میدان جنگ میں سب سے آگے رکھتے تھے جس کا تذکرہ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں حسب ذیل الفاظ میں فرمایا ہے۔

وکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ اذا احمر الباس و احجم الناس قدم اہل بیتہ فوقی بھم اصحابہ حر الاسنۃ والسیوف فقتل عبیدۃ بن الحارث یوم بدر وقتل حمزۃ یوم احد وقتل جعفر یوم موتۃ

"جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس موقع پر کہ جب خونریز صورت جنگ کی سامنے آجاتی تھی اور لوگوں کے قدم پیچھے ہٹتے تھے تو آپ اپنے گھرانے والوں کو آگے بڑھاتے تھے اور انکو اپنے اصحاب کے بچاؤ کا ذریعہ بناتے تھے نیزہ و شمشیر کی آنچ سے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عبیدۃ بن الحارث بن عبد المطلب (حضرتؐ کے چچازاد بھائی) جنگ بدر میں (جو سب سے پہلی اسلام کی لڑائی ہے) قتل ہوئے اور حمزہ بن عبد المطلب (حضرتؐ کے چچا) احد میں مارے گئے اور جعفر بن ابیطالب (امیر المومنین کے حقیقی بھائی اور رسولؐ کے چچازاد بھائی) موتہ کے دن شہید ہوئے"۔

یہ طرز عمل حضرت کا بتلاتا ہے کہ اپنا مذہب حضرت کو کس درجہ عزیز تھا اور آپ اُسکے لئے کیسی قربانیاں پیش کرنے کے لئے طیار رہتے تھے۔

آخر میں ضرورت پیدا ہوئی ایک شہید کی جو کمال مظلومیت کا نمونہ ہو تو اُس کے لئے بھی آپنے اپنے جگر کے ٹکڑے حسینؑ ہی کو پیش کیا۔

حسینؓ آپ کو کتنے عزیز تھے؟ آپ کے افعال واقوال سے ظاہر ہے۔
حسین منی وانا من الحسین ۔ احب اللہ من احب حسینا وابغض
اللہ من ابغض حسینا ۔ الحسن والحسین ریحانتای ۔ الحسن و الحسین
سید اشباب اھل الجنۃ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اظہار محبت وفضیلت اسی لیے تھا کہ دیکھو یہ میرا کتنا پیارا بچہ
ہے لیکن اگر حقیقت اسلام پر کوئی وقت پڑے تو میں اس کو بھی فدا کرنے
پر تیار ہوں۔

یہ وہ پہلو ہے واقعۂ کربلا کا جو مسلمانوں کے جوش عمل کیلئے انتہا سے
زیادہ محرک ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں احساس پیدا ہو کہ ہمارا اسلام
وہ ہے جس کی قربانی میں رسولؐ کا پاک خون شامل ہے تو وہ جذبۂ عمل
پیدا ہو جسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

مظلومیت میں ایک کشش ہے اور خاص جذب اور افراد کے قوت
عمل کیلئے ایک خاص تحریک جس کی وجہ سے وہ مذاہب جنہیں ایسے افراد
کی کمی ہے وہ کوشش کرکے اپنے لئے مظلوم تراشتے ہیں اور اُن کے واقعات
دردانگیز پیرایوں میں بیان کرکے دنیا کو اُنکی مظلومیت سے متاثر کرتے ہیں۔
مثلاً حضرت مسیح کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور قرآن میں اسکی
تصریح موجود ہے کہ ماقتلوہ وماصلبوہ وو یعنے اُسکو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ سولی

دی گئی" اس لئے کم از کم ہم تو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے ظلم وستم، سولی پر چڑھائے جانے اور قتل کئے جانے کے جتنے روایات ہیں وہ سب ساختہ وپرداختہ اور طبع زاد ہیں۔ اور انکی اصلیت کچھ نہیں ہے۔

لیکن باوجود اس کے عیسائیوں نے صرف دنیا کو حضرت عیسیٰ کی مظلومیت سے متاثر کرنے کے لئے اُن کے واقعۂ قتل کو کس درجہ اہمیت دی ہے۔ انجیل کے تمام نسخے۔ انجیل متی ہو یا لوقا۔ مرقس یا یوحنا سب ہیں آخری باب مسیح کی سولی پانے کے واقعات پر ضرور مشتمل ہے۔

صرف کتابوں میں درج کرنے ہی پر اکتفا نہیں ہوی بلکہ اُن کے واقعۂ قتل کی یادگاریں صلیب یعنے سولی کی تصویریں طیار کی گئیں اور وہ عیسائی عبادت خانوں میں آویزاں کی گئیں۔ اس یادگار کو ہمہ گیر بنانے اور ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے لئے اُسے عبادت خانوں سے مخصوص قرار نہیں دیا گیا بلکہ لباس کا ایک جزو اسی شکل پر طیار کر کے گلوں میں آویزاں کیا گیا۔ یہ حقیقت ہے اور مسلمان بھی غفلت سے عیسائیوں کی تقلید کر کے اُس کو اختیار کریں تو حقیقت بدل نہیں سکتی کہ یہ گلے کا کانٹا یا ٹائی جو مغربی لباس کا ایک جزو ہے حقیقۃً صلیب کی تصویر ہے جو یادگار کے طور پر گلوں میں آویزاں کی جاتی ہے۔

مسیح کا آخری کھانا اپنے حواریین کی معیت میں جس کے متعلق کہا

جاتا ہے کہ "یسوع نے روٹی لی اور برکت چاہ کر توڑی اور شاگردوں کو دیکر کہا کہ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دیکر کہا کہ تم بھی اس میں سے پی لو کیوں کہ یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے" (متی ب ۲۶ عدد ۲۶-۲۸ مرقس ب ۱۴ عدد ۲۳-۲۴ لوقا ب ۲۲ عدد ۱۹-۲۰)

اس واقعہ کی یادگار بالکل اسی صورت پر ہر سال منائی جاتی ہے اور گرجوں میں اسی طرح کھانا لاکر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسیح کا گوشت ہے اور پانی لاکر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسیح کا خون ہے اور وہ کھایا پیا جاتا ہے۔ خود انجیل لوقا میں اس یادگار کو قائم رکھنے کی ہدایت بھی موجود ہے چنانچہ اسمیں ہے وہ پھر اُس نے روٹی لی اور شکر کر کے توڑی اور یہ کہکر اُنکو دی کہ یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لئے بھی کیا کرو اور اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہکر دیا کہ یہ پیالہ میرے اُس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے"

یہ کس لئے ہے؟ اسی لئے کہ مسیح کی مظلومیت سے ہمدردی حاصل کی جائے۔ حالانکہ مسیح کی مظلومیت باوجود ان خود ساختہ واقعات کے اُس مظلومیت کی پاسنگ بھی نہیں ہے جو مظلوم کربلا حسینؑ بن علیؑ کی ذات سے مخصوص ہے۔ مسیح کے یہاں خود انجیل کے بیانات کی بنا پر وہ استقلال

تھا جو حسینؑ کے یہاں پایا جاتا ہے۔

پھر کیا یہ افسوس کا امر نہیں ہے کہ حضرت مسیح کی مظلومیت کے لئے تو اُن کے ماننے والوں کی طرف سے یادگاریں قائم کی جائیں اور یہ کوشش ہو کہ کسی وقت اُنکی یاد دل سے محو نہ ہونے پائے لیکن جو حقیقی مظلوم ہو، جس نے روحانیت کے راستہ میں اپنا اور اپنے عزیزوں کا خون بہنا گوارا کیا ہو اُسکی یادگار قائم کرنے میں خود مسلمانوں کے اندر اختلاف ہو اور بہت سے لوگ اُسکی یادگار قائم رکھنا گوارا نہ رکھتے ہوں۔

یہ حقیقۃً مسلمانوں کی بدقسمتی ہے۔ اگر وہ حقیقۃً اسلام سے ہمدردی رکھتے اور عقل و تدبر سے کام لیتے تو وہ متفق طور سے حسین بن علیؑ کا دامن ہاتھ میں تھامتے۔ اُن کی مظلومیت کو دنیا کے سامنے پیش کر کے دنیا کو اپنے مذہب کی روحانیت کا گرویدہ بنا لیتے۔

خدا کے لئے اس بحث کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ قاتلان حسینؑ شیعہ تھے یا سنی؟ یہ عجیب بات ہے کہ شیعوں کو کہا جائے قاتلان حسینؑ شیعہ تھے تو شیعہ اُسے بُرا مانیں اور کہیں کہ وہ شیعہ نہیں سنی تھے۔ سنیوں کو کہا جائے قاتلانِ حسینؑ سنی تھے تو سنی برافروختہ ہوں اور کہیں کہ نہیں وہ شیعہ تھے لیکن ان دونوں کا جو مشترک نتیجہ ہے اور وہ یہ کہ قاتلان حسینؑ مسلمان تھے اُسکو کوئی بُرا نہیں مانتا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر شیعہ کہنے سے تشیع پر دھبا آتا ہے اسلئے شیعہ راضی نہیں ہوتے۔ سنی کہنے سے سنیت پر دھبا آتا ہے اس لئے سنی راضی نہیں ہیں تو کیا مسلمان کہنے سے اسلام پر دھبا نہیں آتا۔ پھر مسلمان اس پر راضی کیوں ہوتے ہیں۔

یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ زبان سے کہنے کو چاہے شیعہ ہوں اور چاہے سنی لیکن حقیقۃً روح اسلام اُن میں موجود نہ تھی اور حقیقت مذہب کا پتہ نہ تھا۔ اِس لئے وہ مسلمان ہی نہ تھے شیعہ اور سنی کا سوال بیکار ہے۔ عہ

اسلام وہ تھا جس کے لئے حسینؑ نے اپنا خون بہایا اس لئے تمام مسلمانوں کو یکساں حیثیت سے اُنکی قدر کرنا چاہیئے۔

حسینؑ نہ شیعوں کے حسینؑ ہیں حسینؑ نہ سنیوں کے حسینؑ ہیں حسینؑ اسلام کے حسینؑ ہیں۔

تمام عالم اسلام کو چاہیئے کہ وہ حسینؑ کی شخصیت کو تمام اقوام و ملل کے سامنے پیش کرے اور کہے کہ کوئی دنیا کا مذہب ایسا مظلوم پیش کر سکتا ہے جس نے اِس طرح اپنی مذہب کے لئے قربانی پیش کی ہو؟

بیشک واقعہ کربلا کا یہ ایسا پہلو ہے جس کے لئے بیش از بیش حیثیت

عہ۔ اِس بحث کو دیکھنے کے لئے کہ ظاہراً وہ کیا تھے؟ شیعہ تھے یا سنی؟ ملاحظہ ہونا چاہیئے ہمارا رسالہ (قاتلان حسینؑ کا مذہب)

ہے اُسکی یادگار قائم کرنے میں جد وجہد کی ضرورت ہے اور اسلئے مذہبی تعلیمات نے اِس واقعہ کے اوپر نوحہ و ماتم۔ رنج و غم اور مظاہرہ حسرت و مصیبت کی تبلیغ کا انتہا درجہ انتظام کیا اور خود حضرت احدیت نے اِس شہادت کے ہونے پر موجودات عالم میں تلاطم اور نظام سموات وارض میں اضطراب پیدا کر کے دنیا کو اُسکی اہمیت کا احساس کرایا۔ اور پیغمبر اسلام حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اسوہ حسنہ کی مثال پیش کر کے اس مصیبت پر اظہار رنج و اندوہ کرنے کی تعلیم دی۔

یہ متفق علیہ حدیث ہے حضرت ؐ کی کہ من رأنی فقد رأنی فان الشیطان لا یتمثل بصورتی۔ "جس نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے مجھ ہی کو دیکھا ہے کیوں کہ شیطان میری صورت کے ساتھ متشکل نہیں ہو سکتا" (ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ جس میں متعدد طریقوں سے یہ حدیث درج ہے)

اس روایت کی بنا پر وہ خواب جس میں حضرت رسول اکرم ؐ کو دیکھا گیا ہو کسی طرح غیر مستند نہیں ہو سکتا۔

اور پھر جبکہ اُس خواب کا دیکھنے والا کوئی جلیل القدر رفیع المرتبت روحانی و ربانی انسان ہو جیسے حبر الامتہ ترجمان القرآن رئیس المفسرین عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جنکے متعلق استیعاب۔ اصابہ۔ اسد الغابہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ انہ رأی جبرئیل مرتین ودعالہ

النبی مرتین" اُنھوں نے دو مرتبہ بچشم خود جبرئیل کا مشاہدہ کیا اور حضرت رسولؐ نے دو مرتبہ ان کے لئے دعائے خیر کی"۔ جنکے متعلق رسولؐ نے دعا کی تھی اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ الحکمۃ" خداوندا اسے دین میں فقیہ قرار دے اور اسے حکمت کی تعلیم عطا فرما"۔

ایسے شخص کا خواب کوئی معمولی وزن نہیں رکھتا۔ اُنھوں نے روزعاشورا اُسی دن جب امام حسینؑ شہید ہوئے ہیں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اشعث اغبر بیدہ قارورۃ فیھا دم یلتقطہ فسألہ فقال دم الحسین واصحابہ لم ازل التقطہ منذ الیوم " حضرت کے سر و ریش مبارک کے بال پریشان ہیں، گرد و غبار پڑا ہوا ہے۔ ہاتھ میں ایک شیشہ ہے جس میں خون بھرا ہوا ہے۔ ابن عباسؓ نے دریافت کیا، فرمایا یہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا خون ہے۔ میں آج دن بھر اس کو جمع کرتا رہا ہوں"۔

حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا خواب اسی دن جو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے۔ رأت النبی صلی اللہ علیہ وسلم باکیا وبراسہ ولحیتہ التراب فسألتہ فقال قتل الحسین انفا" اُنھوں نے رسالتمآبؐ کو دیکھا کہ حضرت رو رہے ہیں اور آپکے سر و ریش پر خاک ہے۔ ام سلمہ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ ابھی ابھی حسینؑ قتل ہوئے ہیں۔

(صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۱۱۸۔ ۱۱۹) یہ رسالتمآب کا عمل ہے جو دنیائے اسلام کے لئے نمونۂ اتباع ہے۔ ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

یہ سب اس غرض کے لئے تھا کہ مظلوم کی مظلومیت قائم رہے اور اُس مظلومیت سے وہی فائدہ اُٹھایا جائے جو فائدہ اُس میں حقیقۃً مضمر تھا۔

دوسرا سبق

جذبۂ ہمدردی اور تعاون باہمی

قومیت کی بنا ہمدردی اور تعاون باہمی پر ہے۔ اسلام نے اسکی خاص طور سے تعلیم دی ہے۔ رؤسائے مذہب نے اس کی کافی اہمیت دکھلائی ہے۔ فرائض انسانی کے دو شعبے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق الناس ان میں حقوق الناس کی اہمیت شرعی لحاظ سے حقوق اللہ سے زیادہ ہے۔ خداوند عالم اکثر اپنے حقوق سے درگذر کر لیتا ہے جب کہ حقوق الناس سے اُن کا تصادم ہو۔

عبادت کے مفہوم کو غلط سمجھے ہیں جنھوں نے اُس کو نماز و روزہ وغیرہ میں محدود قرار دیا ہے اور انہی کو غرض خلقت انسانی قرار دیکر گوشہ گیری و زاویہ نشینی میں اپنے فائدہ وجود کو منحصر قرار دے لیا ہے۔

ابنائے ملّت کی خدمت کرنا، اپنے بنی نوع کے کام آنا، دوسروں کے درد دکھ میں شریک ہونا، دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو ذاتی طور سے محراب عبادت میں مشغول عبادت رہنے سے زیادہ ہیں۔ سچے مذہبی رہنما اپنے تعلیمات کے ذریعہ سے ان کی اہمیت کو واضح کرتے رہے ہیں اور عام عبادتوں پر ان کو مقدم بتایا ہے ملاحظہ ہو امام جعفر صادقؑ کی حدیث جس کو ابان بن تغلب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اُن کا بیان ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السّلام کے ساتھ طواف میں مشغول تھا، ایک شخص میرے دوستوں میں سے آیا، اور اُس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اُس کی ایک ضرورت کے سلسلہ میں اُس کے ساتھ جاؤں۔ (ابان نے بظاہر توقف کیا یا طواف میں مصروف ہونے کا عذر کیا) امام کو احساس ہوا فرمایا۔ یا ابان من ھذا الرجل یہ کون ابان! یہ کون شخص تھا؟ میں نے عرض کی۔ رجل من موالیک سألنی ان اذھب معہ فی حاجتہ "حضور ہی کے غلاموں میں سے ایک تھا، مجھ سے خواہش کی کہ میں اُس کے ایک کام کے لیے اُسکے ساتھ جاؤں"۔ حضرت نے فرمایا یا ابان اقطع طوافک وانطلق معہ فی حاجتہ فاقضھا لہ "ابان! طواف قطع کر دو اور اُسکے ساتھ اُسکے کام کیلئے چلے جاؤ اور اُسکی ضرورت کو پورا کر دو"۔

میں نے عرض کیا کہ میرا طواف ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ احص ما طفت وانطلق معہ فی حاجتہ "جتنا طواف کر چکے ہو اُسکو یاد رکھو اور اُسکی ضرورت کیلئے چلے جاؤ۔"

ابان کہتے ہیں میں نے عرض کیا۔ وان کان طواف فریضۃ "اگرچہ طواف واجبی ہو تب بھی اُسے قطع کر دوں؟" حضرت نے فرمایا۔ نعم و ان کان طواف فریضۃ "ہاں اگرچہ واجبی طواف کیوں نہ ہو" یہاں تک کہ حضرت نے فرمایا۔ لقضاء حاجۃ المؤمن خیر من طواف وطواف حتی عد عشر اسا بیع "یقین جانو کہ ایک برادر مومن کی ضرورت کے وقت کام آنا بہتر ہے ایک طواف اور دو طواف یہاں تک کہ ستر طوافوں سے" (وسائل الشیعہ ج ۲ ص ۳۱۸)

یہ تعاون باہمی، یہ اتحاد و یکجہتی کی تعلیم ہے جس پر اجتماع و تمدن کی بنیادیں قائم ہیں۔ یہ وہ ہے جو ارتقائے قومی کا سنگ بنیاد ہے اور جس پر شیرازۂ قومی کے اجتماع کی عمارت قائم ہے۔

یہ تعاون پیدا ہوتا ہے ہمدردی و غمخواری کے جذبات سے، دوسروں کے درد کے احساس اور اُس درد کے ساتھ تاثر سے۔ اور یہ درد غیر کا احساس اور اُس سے تاثر رقت قلب کا نتیجہ ہے سخت دل انسان کو کبھی دوسرے کے درد اور اذیت سے تاثر پیدا نہ ہوگا، اور اس لیے کبھی

وہ ہمدردی و غمخواری بھی نہیں کر سکتا۔

اس کے لئے واقعۂ کربلا کو موثر ذریعہ قرار دیا گیا اور اُس پر آہ و بکا، رنج و ماتم کی تعلیمات قومی مزاج میں ہمدردی غمخواری اور دوسرے کی مصیبت سے خود متاثر ہونے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے دیے گئے ہیں، اور اس طرح عزاداری امام حسین علیہ السلام کو افراد قوم کی عملی تربیت اور قومی شیرازہ بندی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

یہ اور بات ہے کہ ان اسباب و ذرائع کو عام افراد صرف رسمی حیثیت سے اختیار کریں اور اُس کے اصلی مقصد پر نظر نہ ڈالیں۔ مظلومیت کا اعلان، مظلومیت کے مظاہرات، مظلومیت پر احساسات کا برافروختہ کرنا یہ سب درحقیقت عملی تعلیم کے ذرائع تھے، لیکن دنیا اس مقصد پر نظر نہیں ڈالتی، اُس کے حقیقی مفاد کو دیکھتی نہیں اور دو فریق میں منقسم ہو جاتی ہے۔

ایک فریق تو صرف اس ذریعہ کی ذاتی حیثیت پر نظر ڈالتا ہے، اور افادی حیثیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے اُن رسوم کو بیکار کہنے لگتا ہے

دوسرا فریق اُس کی ذاتی حیثیت کو مقصد سے علیحدہ کر کے اُسے صرف رسمی حیثیت سے اختیار کرتا ہے اور اس طرح اصل مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔

یہ دونوں جماعتیں نقطۂ افراط و تفریط پر ہیں۔ اسلام نے جو تعلیم
دی تھی اُس کا مقصد صرف تہذیب عمل تھا۔ لہذا ہر امر کے افادی پہلو پر
نظر رکھنا ضروری ہے، اور اس پہلو پر نظر کرتے ہوئے اُسکو بیکار
نہیں کہا جاسکتا اور نہ اُسکی اہمیت میں کمی ہوتی ہے۔

اس لیے کہ درحقیقت اہم سے اہم جو فرائض ہیں وہ تمہید عمل ہی
ہیں معرفت باری تعالیٰ ایسی چیز جو انسان کے لیے فرض اور ضروری ہے
وہ تمہید عمل ہونے ہی کی حیثیت سے۔ دیکھ لیجیئے علم کلام کی کتابیں۔ اُن میں
معرفت باری کا لازم ہونا کس دلیل سے ثابت کیا ہے؟ غور و فکر حقائق الٰہیہ
میں کس نظر سے واجب قرار دیا ہے؟ یہ سب اس بنا پر ہے کہ شکر منعم کیلیے
انسان کو عمل کرنا ضروری ہے اسلیے منعم کی معرفت حاصل کرنا لازم۔

تمہید ہونے کی بنا پر یہ نہ سمجھیئے کہ کسی چیز میں اہمیت نہیں ہے۔ رسولؐ
کی معرفت بھی انسان کی عملی آراستگی ہی کے لیے لازم ہے۔ رسولؐ اور امامؑ
ہوئے اسی لیے ہیں کہ دنیا کو عملی حیثیت سے ٹھیک راستہ پر لگائیں۔

حقیقۃً جتنے مقصد ہیں، جتنے اصول اساسی کہے جاسکتے ہیں وہ تمام
صورتوں میں تمہید عمل قرار پاتے ہیں۔ لہذا اگر میں کسی تعلیم کو یہ کہدوں کہ
وہ عمل کی تمہید ہے، تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اُس کی اہمیت کو کم کرتا ہوں
اُس کی اہمیت بجائے خود محفوظ ہے اس لیے کہ عملی زندگی کا انسان کے

حدارتقار پر پہونچنا اسی پر موقوف ہے، اور یہی گریہ و بکا کا فلسفہ ہے۔
حسین مظلومؑ کے دلشکن مصائب کا احساس درحقیقت کامیاب ترین ذریعہ ہے مسلمانوں کیلئے میدان عمل میں گامزن ہونے کا۔

یہ واقعہ کربلا پر اجمالی حیثیت سے تبصرہ تھا کہ واقعہ کربلا دنیا میں کس حیثیت سے دعوت عمل دیتا ہے۔ لیکن اب مجھ کو واقعۂ کربلا کی نوعیت پر نظر کرنا ہے، اور جو صورت واقعہ کربلا میں پیش آئی اسکی اسلامی تعلیمات سے مطابقت کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی تعلیم کونسی ہی جو واقعۂ کربلا سے ثابت ہوتی ہے اور اس لیے یہ باب ہمارے اس سلسلۂ بیان کا اہم ترین باب سمجھنا چاہیئے۔

تیسرا اور سب سے بڑا سبق

رواداری و امن پسندی کیساتھ باطل سے علیحدگی

مظلوم کربلا کے طرزِ عمل کی حضرتِ رسول اور علی مرتضیٰ اور حسن مجتبیٰ کے طرزِ عمل سے مطابقت

صلح و جنگ کے مختلف مواقع میں ایک ہی اصول کی کارفرمائی

اور

شکوک و شبہات کا استیصال

دو چیزیں ہیں اصول اساسی جو پیشوایان اسلام اور رہنمایان ملت کے طرزِ عمل میں توام رہی ہیں۔ اسلام کے تعلیمات میں بھی وہ خاص طور سے کارفرما ہیں۔ وہ دونوں عنصر اگر پہلو بہ پہلو نہوں تو انسان کا طرزِ عمل یا تو حد اعتدال سے باہر نکل جائے یا تفریط کے دائرہ میں رہجائے۔ اسلیے کہ ہروقت خاموشی یا ہر وقت حرکت یہ دو باتیں ایسی ہیں جنمیں سے ایک انسان کیلیے بعض اوقات بزدلی، فرض شناسی سے علیحدگی اور ادائے فرض میں کوتاہی اور دوسری اکثر اوقات فتنہ و فساد اور مفسدہ انگیزی کا باعث ہوتی ہے، انسان کی زندگی میں نہ ہر وقت خاموشی کا ہوتا ہے اور نہ ہر وقت متحرک ہونیکا، بلکہ ہر ایک کیلیے کچھ حدود ہیں کچھ معیار ہیں جس موقع پر بیٹھ رہنے کی ضرورت ہو

وہاں بیٹھ جانا حقیقۃً اخلاق کی جان ہے اور جب کھڑے ہونیکا موقع ہو تو کھڑا ہونا اخلاق کی روح ہے۔

وہ دو اصول اساسی جنکو ہر مسلمان کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، ایک امن و امان کی حفاظت، دوسرے حمایت باطل سے علیحدگی۔

امن و امان جسے ہمیں اپنے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ "جیو اور جینے دو" جسکو فارسی میں "مرنجان مرنج" کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت وہ چیز ہے جسپر تعلیم اسلام کی بنیاد واقع ہوئی ہے۔ اسلام مشتق ہے "سلم" سے "سلم" کے معنی ہیں صلح پسندی رسول اسلام نے ارشاد فرمایا۔ المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ کہیں کہیں یہ بھی میری نظر سے گذرا ہے کہ المسلم من سلم الناس من یدہ ولسانہ۔

اصلی مسلمان وہ ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے اسکے برادران محفوظ رہیں۔ اب خواہ وہ برادران جامعۂ انسانیت ہوں یا برادران جامعۂ مذہب۔ یہ تعلیم وہ ہے جو نظام انسانی اور تعلیمات اسلامی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی خواہ مخواہ تمھارے ہاتھ سے کسیکو تکلیف نہ پہونچے۔ تم کسی سے برسر پیکار نہو۔ جہانتک تمھارے امکان میں ہو اسوقت تک خونریزی سے علٰحدہ رہو۔ کبھی اپنی طرف سے فتنہ و فساد کا سبب نہ بنو۔ خیال فرمائیے، دو لفظیں ہیں جو معتقدین اسلام کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک "مسلم" اور ایک "مومن"۔ "مسلم" "سلم" سے مشتق، اور "مومن" "امن" سے مشتق۔ اس لیے یہ بھی

ارشاد ہوا کہ المؤمن من امنہ المسلمون علی دمائھم واموالھم
امن پسندی بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زبانی تعلیمیں برابر اسکے
متعلق دی گئیں۔ عملاً اس کی پابندی کرکے ہدایت کی گئی۔ اس کا
دائرہ یہاں تک وسیع ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ بھی رواداری برتنے
کا حکم ہے۔ صلح پسندی سے کام لینے کی ہدایت ہے۔ یہ موضوع بہت
اہم ہے۔ غیر مسلم لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں رواداری
نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت حال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے
اکثر مواقع پر بیان کیا ہے کہ اسلام نے غیر مسلم کے ساتھ کسطرح رواداری
کا حکم دیا ہے۔

جناب رسالتمآبؐ کے سچے شاگرد روحانی یعنی حضرت علی بن ابیطالب
علیہ السّلام مالک اشتر کو مصر کا حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں، اُس موقع پر
ایک عہد لکھ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو اپنا لائحہ عمل بنانا۔
اُس میں فرماتے ہیں۔

لا تکونن علیھم سبعاً ضاریاً تغتنم اکلھم فانھم صنفان
اما اخ لک فی الدین او نظیر لک فی الخلق۔ تم اہل مصر
کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار نہ کرنا کہ معلوم ہو تم درندہ حیوان ہو جو انھیں
کھا لینا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں کے لوگ دو ہی قسم کے ہیں

یا تو تمھارے مذہبی بھائی ہیں ورنہ خلقت یعنی جامعۂ انسانیت میں تمھارے شریک ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مساوی طور سے ہر فریق کے ساتھ رواداری کی ہدایت ہو رہی ہے۔ اتنی ہمہ گیر رواداری کی مثال کوئی مذہب دنیا کا سوائے اسلام کے نہیں پیش کر سکتا۔

دوسری بات جو سب سے بڑی اور اہم اسلام کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ " باطل کی حمایت نہ ہو، حق پر قائم رہو۔ ناحق بات کی تائید تمھاری طرف سے نہ ہونے پائے۔ باطل کی ذمہ داری تمھاری طرف عائد نہ ہونے پائے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جس پر جناب رسالتمآبؐ اور اُنکے پیروانِ حقیقی کے سیرت کی بنیاد قائم ہے۔

امن پسندی اور امن پسندی کے ساتھ ساتھ حمایت باطل سے علٰحدگی۔ یہی دو عنصر آپ کو ساتھ ساتھ حضرت رسولؐ اکرم اور آپ کے اہلبیتؑ کے طرزِ عمل میں ملیں گے۔ یعنی جہاں تک اپنے اوپر حمایت باطل کی ذمہ داری نہ عائد ہو۔ اپنے اوپر حمایت باطل کا الزام نہ آتا ہو، اس وقت تک چاہے جتنے بھی نقصانات برداشت کرنا پڑیں اور اپنے ذاتی مفاد کی حیثیت سے دبنا بھی پڑے مگر امن پسندی قائم رہے لیکن جس وقت خاموشی میں حمایت باطل کی صورت پیدا ہو بس وہیں سے خاموشی

کی مہر ٹوٹ جائے اور جس حد تک اقدام ضروری ہو یعنی جس حد تک آگے بڑھنا اس باطل پسندی کے الزام سے الگ کر دے وہاں تک اقدام عمل کریں مگر اس صورت میں بھی امن پسندی کا مسلک پیش نظر رہے یہ چیز ہے جو رسالتمآبؐ کے طرز عمل میں آپ کو نمایاں ملے گی۔ اور اُنکے تبعین کی سیرت میں بھی وہ روشن حروف میں نظر آئے گی۔

میں جس وقت تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالتا ہوں اور رسالتمآبؐ۔ حضرت علیؑ۔ امام حسنؑ۔ امام حسینؑ کے طرز عمل پر نگاہ ڈالتا ہوں تو تاریخ میرے سامنے عمل کے ملتے جلتے ہوئے نمونے پیش کرتی ہے۔ مجھے حالات یکساں نظر آتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مختلف آئینے ہیں مگر صورت ایک ہی ہے جو اُن آئینوں میں نظر آرہی ہے۔

کسی موقع پر صلح کسی موقع پر جنگ۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ رسالتمآبؐ کا ایک مکمل آئینہ میرے سامنے لگا ہوا ہے۔ جو صلح و جنگ کا مخلوط مظاہرہ پیش کر رہا ہے۔ وہی نقشہ امیر المومنینؑ کے طرز عمل میں اُسی صورت سے نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جس طرح ایک نور کے دو ٹکڑے ہونے کا تقاضا ہے، جب میں دیکھتا ہوں تو حسنؑ و حسینؑ کی ہستیاں مجموعی حیثیت سے رسالتمآبؐ کے طرز عمل کا نمونہ پیش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ [۱] یعنی ایک ان میں سے صلح کا مظہر ہے اور دوسرا

(۱) درحقیقت امام حسنؑ کی صلح ہی مجاہدہ کربلا کی تمہید تھی۔ اسکی تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو ہمارا رسالہ "حسین اور اسلام"

جنگ کا۔ اگرچہ وہ جنگ بھی جیسا کہ آئندہ آئے گا شروع سے آخر تک امن پسندی و صلح طلبی کے مظاہرات سے لبریز ہے۔ انسانی طبائع چونکہ سب نقطۂ اعتدال پر نہیں ہوا کرتے۔ اُن میں اکثر جذبات پائے جاتے ہیں اور جذبات اکثر عقل و تدبّر سے الگ ہوتے ہیں، اس لیے صلح کے موقع پر منچلی طبیعتیں صلح کو قابلِ اعتراض سمجھتی اور جنگ کے موقع پر کمزور طبیعتیں جنگ کو ناقابلِ قبول خیال کرتی ہیں، مگر وہ لوگ جنکے طرزِ عمل کبھی جذبات کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ عقل کے پابند ہوتے ہیں وہ صلح کے موقع پر جذبہ انتقام سے مغلوب نہیں ہو جاتے تھے، اور جنگ کے موقع پر کمزوری کی وجہ سے جنگ سے باز نہیں رہتے تھے۔

صلح و جنگ کے مختلف نقشے

(۱)

رسالتمآب کا طرزِ عمل

حدیبیہ کی صلح اور امن پسندی کا بہترین مظاہرہ

جنابِ رسالتمآب نے اذیتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اُٹھائیں۔ ارشاد فرمایا ہے۔ ما اوذی نبی قط کما اوذیت۔ کسی نبی کو اتنی اذیتیں

نہیں دی گئیں جتنی ایذائیں مجھ کو پہونچائی گئیں"۔

پتھر پھینکے جاتے تھے اور آپ کا جسد مبارک زخمی ہو جاتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ پتھروں کے اندر چھپ گئے ہیں۔ کبھی سر اور روئے مبارک پُر خون ہو جاتا تھا، لیکن زبان کلمۂ حق کے ساتھ گویا رہتی تھی۔ قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا۔ کی آواز بلند تھی۔ اس ثبات قدم اور استقلال کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنے اور اعلائے کلمۂ حق کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ کلمۂ حق کی آواز تمام دنیا میں گونج اٹھی اور وہی لوگ جو آپ سے برسرِ پیکار تھے اُن کو آپکے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

جب مکہ میں مصائب کا خاتمہ ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اب اگر آپ مکہ معظمہ میں قیام فرماتے تو آپ کی زندگی کا چراغ حقیقت نما گُل کر دیا جاتا۔ اُس وقت حضرتؐ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی اور خاموشی کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ یہ رواداری کا ثبوت تھا۔ اگر دیکھا جائے تو وہی انصار جو مدینہ منورہ میں آپ کی حمایت کیلئے موجود تھے وہ چڑھائی کر کے مکہ معظمہ بھی آسکتے تھے۔ آپ مکہ میں رہکر ایسے اسباب مہیا فرماتے جن کی بدولت آپ اپنی مخالف جماعت کو مغلوب کر سکتے۔ مگر آپ نے وہاں رہ کر کسی ایسے اقدام کا ارادہ نہیں کیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ چاہے تم جتنا ہمیں آزار پہونچاؤ مگر ہم تم سے جنگ کرنا

نہیں چاہتے۔ ہم تو صرف حفاظت خود اختیاری کے اصول پر اپنی زندگی کو محفوظ کرتے ہوئے تمھارے درمیان ہی سے چلے جاتے ہیں۔ مگر تمھارے خلاف کوئی اقدام عمل نہ کرینگے۔

تمھیں ہمارا رہنا یہاں منظور نہیں ہے؟ اچھا۔ ہم مدینہ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اب تو تم "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کر کے ہماری جان سے ہاتھ اُٹھاؤ، مگر وہ لوگ جنھیں رسولؐ کی زندگی مکہ معظمہ میں گوارا نہ تھی انھیں آپ کی زندگی مدینہ منورہ میں بھی گوارا نہ ہوئی۔ وہاں بھی آپ پر چڑھائی کی جانے لگی اور آپ کے قتل کا ارادہ ہوا۔ جب دیکھا آپ نے کہ اب اگر خاموش رہے تو وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی ہے اُن کا بھی خون رائگاں ہوگا۔ اُن کا شہر بھی اُن کے قبضہ سے نکل جائے گا لہٰذا اب خاموشی جرم تھی۔ اب تلوار اُٹھائی۔ جہاں جہاں تک چڑھائی کر کے لوگ آئے آپ نے مدافعت کی جتنی لڑائیاں ہوئیں سب مدافعانہ ہی ہوئیں، یعنی جب لوگ چڑھ کر آئے تب آپ مدافعت کے لیے گھر سے باہر نکلے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک قائم رہا جب تک مشرکین کی طاقت میں رمقِ جان باقی رہی، ہر دفعہ پہلی مرتبہ سے زیادہ طاقت کو بڑھا کر آتے رہے۔

بدر میں تعداد بہت تھی مگر پھر بھی کم، اُس میں شکست ہوئی تو احد میں

پوری جمعیت کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے۔ اور جب پھر شکست ہوئی تو انفرادی طاقت کو کافی نہ سمجھ کر اطراف وجوانب کے قبائل اور یہود کی جماعتوں کے ساتھ متفق ہو کر رسولؐ کے مقابلہ میں آئے، اور اس وجہ سے اس جنگ کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی اس میں جتنی جماعتیں کفار کی تھیں سب متفق ہو کر رسولؐ سے برسر پیکار ہوئی تھیں۔ جب اس میں بھی شکست ہوئی تو ہمتیں پست ہوگئیں۔ اب قریش میں کسی جنبش کی طاقت نہ تھی۔ یہ آخری کوشش تھی جو ناکام ہوئی۔ احد کے بعد آرزو تھی، کہ اجتماعی طاقت سے حملہ کریں، لیکن اب وہ بھی ہو چکا تھا۔ اب کوئی امید نہ تھی اس لیے اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئی ہیں وہ یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ مشرکین مکہ اور قریش کے ساتھ آخری جنگ فیصلہ کن احزاب ہی کی تھی۔

اس کے بعد رسالتمآبؐ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا حج کے لیے۔ آپ کے ساتھ بدنے (یعنی قربانی کے اونٹ)[۱] تھے، جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔

جس وقت مکہ معظمہ کے قریب پہونچے تو گو قریش میں طاقت مقابلہ کی نہ تھی، ہمتیں پست ہو چکی تھیں مگر عناد کی آگ فرو نہ ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ حج سے روکنے پر آمادہ ہوگئے اور خالد بن الولید کی قیادت میں

(۱) طبری ج ۳ ص ۳

جو اکثر مورخین کے قول کی بنا پر اب تک حالت کفر میں تھے" کراع الغمیم" مقام تک مقابلہ کیلیے آ گئے۔

ملاحظہ ہو کہ رسالتمآبؐ کی فوج اور آپ کے ساتھیوں کی ہمتیں پے در پے فتوحات حاصل ہونے سے بڑھی ہوئی، مشرکین کی فوج کو متعدد بار شکست دیے ہوئے، اس صورت میں رسالتمآبؐ کے لیے عام افتاد طبع کی بنا پر جو انسانوں میں ہوا کرتی ہے یہ مناسب وقت تھا کہ آپ اپنی فوج کو جو سلاح جنگ سے آراستہ تھی ہی حملہ کا حکم دیدیتے اور دشمن کو شکست دیکر مکہ معظمہ پر قبضہ کرتے۔

مگر آپ کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم جب مجبور کیے جاتے ہیں تب ہی لڑتے ہیں۔ گرد و غبار اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اصحاب کی نظریں اٹھیں معلوم ہوا لشکر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اس راستہ کو چھوڑ دو۔ دوسرے راستہ سے چلو۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت نے فرمایا من رجل یخرج بنا علی طریق غیر طریقھم التی ھم بھا۔ "کون شخص ہے جو ہم کو کسی دوسرے راستہ سے نکال لے چلے اس راہ کے علاوہ جس پر یہ ہیں" (۱)

یہ اس بات کا ثبوت دینا تھا کہ ہمیں لڑنا نہیں منظور ہے۔ چنانچہ حضرت نے داہنی جانب کا رخ کیا "حمص" کی پشت پر "ثنیۃ المرار"

(۱) صد۳ے

سے ہوتے ہوئے "حدیبیہ" کو جو راستہ جاتا ہے اُدھر متوجہ ہوئے۔

مخالف فوج کی پست ہمتی اسی سے ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عناد سے مشتعل ہو کر سامنے نکل آئے تھے، مگر لڑنے کے لیے تیار نہ تھے کہ انھوں نے جب دیکھا، رسالتمآب نے راستہ بدلدیا تو وہ بھی واپس گئے۔

یہ امن پسندی کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو رسالتمآب نے دیا۔

اب مشرکین نے اپنی طرف سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ عروہ بن مسعود ثقفی آیا جس نے گفتگوئے صلح کا آغاز کیا۔ حالت یہ تھی کہ مغیرہ بن شعبہ حضرت کے سر پر تلوار کا سایہ کیے کھڑے تھے۔ عروہ اثنائے گفتگو میں اپنا ہاتھ بار بار حضرتؐ کے چہرہ کے قریب لاتا تھا جس طرح بےباکی سے باتیں کیجاتی ہیں۔ جب اُس کا ہاتھ حضرت کے چہرہ کے قریب آتا تھا مغیرہ کی تلوار اُسکے ہاتھ کے اوپر جھکتی تھی۔

عروہ نے خود کفار کے پاس جا کر کہا کہ میں نے کسریٰ، قیصر، نجاشی بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں، مگر ان بادشاہوں کی ہیبت میری نظر میں اتنی نہیں سمائی جتنی اس رسولؐ کی۔ حضرت کی صلح پسندانہ باتوں سے خوشگوار توقعات قائم ہو چکے تھے۔ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بن کر مختتم گفتگوئے صلح کے لیے حضرت کے پاس بھیجا گیا۔

اور اس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس سال آپ واپس جایئے اور حج نہ کیجئے اسکے بعد دیکھا جائے گا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ منزلوں کی مسافت قطع کر کے اتنی بڑی جماعت حج کیلیے آئی ہو اور اُسے روکا جائے۔

مگر حضرتؐ نے فرمایا کہ اچھا ہم واپس چلے جائیں گے۔ یہ انتہائی صلح پسندی کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد ملاحظہ ہو کہ صلح نامہ جو ہوا ہے اُس کے شرائط کیا ہیں۔ عام الفاظ میں تو یہی کہنا چاہیے کہ آپنے دب کر صلح کی یعنی شرائط ایسے قرار دیے جو کفار قریش کی مرضی کے مطابق اور آپ کی مصلحت کے خلاف تھے، مگر حضرتؐ نے اس سب کو منظور کیا اور تمام باتوں کا تحمل فرمالیا۔

وقت آیا کتابت عہد نامہ کا، اور حضرتؐ نے امیر المومنین علیؑ کو صلحنامہ کی تحریر کا حکم دیا۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق کاغذ لیا اور سرنامہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر فرمایا۔ اس میں کونسی بات تھی۔ خدا کا نام تھا اور اسلامی نشان۔ مگر سہیل نے اعتراض کیا۔

یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہم نہیں جانتے، وہی لکھو جو ہماری تحریروں میں لکھا جاتا ہے۔ باسمک اللھم۔ اگر یہ فقرہ کوئی غلط معنی رکھتا ہوتا تو یہیں سے دوسرا شعبہ اسلام کی عملی تعلیم کا سامنے آجاتا۔

کہ حمایت باطل نہ ہونا چاہیے لیکن معنیٰ کا کوئی تفرقہ نہ تھا! اسم مظہر یہی ضمیر خطاب سہی کہ "خداوندا تیرے نام سے شروع کرتا ہوں"۔ بات ایک ہی تھی لہٰذا حضرت نے رواداری صرف فرمائی۔ یہ دکھلایا کہ ہم لفظی بحث میں نہیں پڑتے، معنیٰ پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا لکھا گیا

باسمک اللّٰھم۔ اس کے بعد جناب رسالتمآب نے صلحنامہ کا مضمون بتانا شروع کیا، اور امیر المومنینؑ لکھنے لگے۔ فرمایا لکھو ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللّٰہ سھیل بن عمرو۔

یہ وہ معاہدہ ہے جس کے اوپر صلح ہوئی، خدا کے رسول محمدؐ اور سہیل بن عمرو کے درمیان"۔ سہیل نے اعتراض کیا۔

لو شھدت انک رسول اللّٰہ لم اقاتلک ولکن اکتب اسمک واسم ابیک۔

"ہم اگر آپ کو خدا کا رسول سمجھتے تو آپ سے برسرپیکار کیوں ہوتے لہٰذا آپ بس اپنے اور اپنے والد کا نام لکھیے ا رسول اللّٰہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے"

رسالتمآب دنیا کو تعلیم دینا چاہتے تھے کہ واقعیت جو ہوتی ہے وہ ہزار پردوں میں بھی واقعیت ہی رہتی ہے۔ اپنے نام کے ساتھ سے کسی لقب کو ہٹا دینا یہ کسی حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا

کہ "ہاں! یہی لکھو! میں تو ہوں ہی خدا کا رسول لکھنے کی کیا ضرورت ہے"

یہاں پر ادب شناسی امیر المومنینؑ کی قابل ملاحظہ ہے۔ آپ نے توقف کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے رسول اللہؐ کے الفاظ کو کیونکر مٹاؤں؟

طبری کی عبارت ہے قال لعلی امح رسول اللہ "فرمایا علیؑ سے کہ مٹا دو رسول اللہ کے لفظ کو" جواب دیا لا واللہ لا امحوک ابداً۔ "نہیں! خدا کی قسم! میں تو آپ کے نام کو محو نہ کرونگا"۔ (۲) حضرتؐ نے فرمایا لاؤ کاغذ میرے ہاتھ میں دو۔ آپ نے خود کاغذ لے کر اپنے ہاتھ سے اس لفظ کو محو فرما دیا۔

یہ دوسری بہت بڑی رواداری کی مثال ہے۔ یہ دکھانا منظور ہے کہ کفار کے ساتھ بھی مساویانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ جس طرح سے اُس کا نام لکھا گیا اسی طرح اپنا نام لکھوایا۔ تحریر یہ ہوا۔ ھذا ما صالح علیہ محمد بن عبد اللہ سھیل بن عمرو۔

"یہ وہ ہے جس پر صلح کی عبداللہ کے بیٹے محمدؐ نے عمرو کے بیٹے سہیل کے ساتھ۔

اصطلحا علی وضع الحرب عن الناس عشر سنین یأمن فیھن الناس و یکف بعضھم عن بعض۔ صلح ہوئی کہ دس برس تک

---

(۱) طبری ج ۳، صـ۷۹ (۲) صـ۸۰

ہمارے درمیان جنگ نہ ہوگی۔ اس میں لوگ امن وامان کے ساتھ رہیں گے اور ایکدوسرے سے ہاتھ روکے رہیگا۔"

علیٰ انہ من اتی رسول اللہ من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیھم ومن جاء قریشا ممن مع رسول اللہ لم تردہ علیہ۔

"عجیب شرط ہے۔ لحاظ کے قابل" اس بات پر صلح ہوئی ہے کہ جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کے اذن بغیر رسول اللہ کے پاس چلا جائے (اکثر لوگوں کے بھائی بیٹے یا دوسرے عزیز مسلمان ہوجاتے تھے تو اُن پر سختیاں ہوتی تھیں، وہ مدینہ منورہ چلے جاتے تھے) تو ایسے لوگوں کو آپ واپس کردیں گے مشرکین کی طرف مگر جب آپکے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نکرینگے۔"

وانہ من احب ان یدخل فی عقد رسول اللہ وعھدہ دخل فیہ ومن احب ان یدخل فی عقد قریش و عھدھم دخل فیہ۔

"جو شخص رسالتمآب سے حلیف ہونا چاہے وہ آپ کا حلیف ہوجائے، اور جو قریش کے ساتھ ہم عہد و پیماں ہونا چاہے وہ انکے ساتھ ہوجائے۔"

(اس شرط کے ہونے کے ساتھ ہی قبیلہ خزاعہ کے نمایندے اپنی جگہ

سے اُٹھے اور اعلان کیا کہ ہم رسولؐ کے عہد و امان میں ہیں اور بنی بکر اُٹھے، انھوں نے کہا ہم قریش کے عہد و پیمان میں ہیں۔

وانک ترجع عنا عامک ھذا فلا تدخل علینا مکۃ وانہ اذا کان عام قابل خرجنا عنک فدخلتھا باصحابک فاقمت بھا ثلثا وان معک سلاح الراکب السیوف فی القرب لا تدخلھا بغیر ھذا۔

اور یہ شرط ہوئی ہے کہ آپ اس سال واپس جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں۔ آیندہ سال ہم آپ کے لیے مکہ کو خالی کردیں گے۔ اور آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوجیئے گا اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ قیام نہ ہو اور آپ کے ساتھ اس طرح کے ہتھیار ہوں جو مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں یعنی تلواریں نیام کے اندر، اسکے علاوہ اور کچھ آپکے ساتھ نہو"

اب آپ فیصلہ فرمائیے کہ رسولؐ کی طرف سے کتنی رواداری کی گئی ہا ایسا شخص جس کے ساتھ فوج و لشکر موجود ہو۔ لشکر بھی ایسا جس کے دل میں فتح مکہ کا خیال قائم ہو چکا ہو۔ اس لیے کہ آپ اس کے قبل خواب دیکھ چکے تھے جس کو آپ نے اپنے اصحاب سے بیان فرمایا تھا اور وہ یہ کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں۔

اصحاب کو یقین تھا کہ مکہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ اس سب کے باوجود رسولؐ نے دب کر صلح کی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ بےچین طبیعتیں جو رسولؐ کی مصلحت کی تہ تک نہیں پہونچ سکتی تھیں، بیتاب ہوگئیں طبری میں ہے۔ فدکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرجوا وھم لا یشکون فی الفتح لرؤیا راٰھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما رأوا ما رأوا من الصلح والرجوع وما تحمل علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفسھا دخل الناس من ذلک امر عظیم حتیٰ کادوا ان یھلکوا۔

"رسالتمآب کے اصحاب مدینہ سے یہ سمجھ کر روانہ ہوئے تھے کہ ہم مکہ معظمہ ضرور فتح کرلیں گے ایک خواب کی بنا پر جو جناب رسالتمآب نے دیکھا تھا۔ اب جو انھوں نے دیکھا کہ صلح ہوگئی اور آپ واپس جا رہے ہیں، اور یہ پابندیاں آپ نے اپنے اوپر عاید کی ہیں تو لوگوں کے دلوں میں امر عظیم پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت ابدی میں واقع ہو جائیں۔ یعنی عقائد میں تزلزل ہوا اور ایسا کہ قریب تھا کفر میں مبتلا ہو جائیں (ص ۷۹ ج ۳)

جب رسالتمآب نے معاہدہ سے فراغت حاصل کی تو تمام اصحاب

سے فرمایا کہ اٹھو اور نحر کرو پھر حلق کرو یعنی سروں کے بال منڈواؤ اور حج کو عمرہ سے بدلکر واپس چلو۔ مگر رسولؐ حکم دے رہے ہیں اور کوئی تعمیل کیلیے نہیں اٹھتا۔ یہاں تک کہ حضرت نے تین مرتبہ یہی فرمایا۔ جب کوئی کھڑا نہوا تو آپ کبیدہ دل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین ام سلمہ کے پاس جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں، تشریف لے گئے اور اُن سے ان واقعات کا تذکرہ کیا۔ ام سلمہ نے عرض کیا کہ "حضور چاہتے ہیں کہ ایسا ہو تو خود تشریف لیجائیے اور کسی سے کچھ کہے بغیر خود آپ اپنے شتر قربانی کو نحر فرمائیے اور حلق راس کرا لیجیے۔" حضرت کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپ نے باہر آکر کسی سے کچھ کہا نہیں مگر آپ نے خود نحر و حلق سے فراغت فرمالی جب لوگوں نے یہ دیکھا تو چار و ناچار مجبور ہو کر کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے ایک دوسرے کے سروں کو حلق کرنا شروع کیا۔ مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایکدوسرے کو قتل کر رہا ہے۔" (۱)

بے شک تاریخ کے فقرات اس موقع پر بتلاتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام بلا استثنار اس صلح سے ناراض تھے اور اُن کے دلوں میں شکوک و شبہات گردش کر رہے تھے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بعض ایسے بھی تھے جنکے دلمیں شک پیدا نہوا تھا۔

(۱) طبری ج ۳ ص۸۰

حضرت علی بن ابیطالب کا تو ذکر ہی نہیں اس لیے کہ وہ تو کاتب صلحنامہ ہی تھے۔ بلکہ طبری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہیل ابن عمرو کفار کا نمائندہ اور رسالتمآبؐ کے نمائندہ حضرت علیؑ تھے چنانچہ اس میں ہے کہ، ان قریشا بعثوا سھیل بن عمرو و حویطبا فونوھم صلحھم و بعث النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم علیا علیہ السلام فی صلحہ۔

"قریش نے سہیل بن عمرو اور حویطب کو صلح کا اختیار دے کر بھیجا اور رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو صلح کا مختار بنایا"۔ (۱)

اسی وجہ سے دوسرے سال جب رسالتمآبؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور مدت تین روز کی جس تک قیام کا وعدہ ہوا تھا منقضی ہو گئی تو کفار قریش حضرت علیؑ ہی کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ قل لصاحبک اخرج عنا فقد مضی الاجل۔

"اپنے رفیق (رسولؐ) سے کہیے کہ بس اب مکہ سے باہر چلیے۔ مدت ختم ہو گئی"۔

اس کو سنکر رسالتمآب مکہ سے تشریف لیگئے (۲)

اس سے ظاہر ہے کہ کفار قریش صلح کا بڑا ذمہ دار امیر المومنینؑ کو

---

(۱) ص۲۷۷ (۲) ص۲۸۰

سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے قرارداد صلح کی یاددہانی کے لیے آپ ہی کی طرف رجوع مناسب سمجھی۔ لیکن حضرت کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی کچھ نہ کچھ ایسے تھے کہ جن کو کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا تھا اور وہ ثبات و استقامت کے ساتھ اپنے مضبوط عقیدہ پر قائم رہے تھے۔

چنانچہ طبری میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب رسالتمآب نے حکم دیا کہ تم سب کے سب تحلیق کرو تو پہلے لوگ آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب ام سلمہ نے مشورہ دیا کہ آپ کسی سے کچھ کہیے نہیں خود تحلیق کر لیجیے حضرت باہر تشریف لائے اور تحلیق فرمائی۔

"تحلیق کے معنی ہیں سر کو اُسترے سے منڈوانا۔ اس کے خلاف صورت ایک ہے "تقصیر" یعنی بالوں کو کہیں کہیں سے ترشوا لینا"۔

جب حضرت تحلیق فرما چکے تو صحابہ چار و ناچار اُٹھے مگر تاریخ میں ہے کہ حلق رجال یوم الحدیبیہ وقصر آخرون" کچھ لوگ ایسے تھے حدیبیہ میں جنھوں نے تحلیق کی اور باقی جتنے تھے سب نے تقصیر کی یعنی بس تھوڑے سے بال ترشوانے پر اکتفا کی۔

حضرتؐ نے فرمایا۔ یرحم اللہ المحلقین۔ "خدا اپنی رحمت نازل کرے محلقین یعنی بال منڈوانے والوں پر"

لوگوں نے کہا والمقصرین یا رسول اللہ۔ "اور تقصیر کرنیوالوں"

آپ نے پھر فرمایا۔

یرحم اللہ المحلقین۔ "خدا رحمت نازل کرے محلقین پر"۔

پھر آواز آئی۔ والمقصرین یا رسول اللہ۔ "خدا کے رسولؐ! بہت سے لوگ مقصرین بھی تو ہیں، ان کے لیے بھی تو ارشاد فرمائیے"۔ حضرتؐ نے فرمایا۔ یرحم اللہ المحلقین۔ "خدا رحمت نازل کرے محلقین پر" لوگوں کا دل نہ مانا پھر کہا۔ یا رسول اللہ والمقصرین۔ یا رسول اللہ مقصرین پر بھی ارشاد ہو۔" حضرتؐ نے فرمایا۔ والمقصرین۔ "اچھا مقصرین بھی سہی"

اب یہ تاریخ کا فقرہ قابل ملاحظہ ہے جو حقیقت حال اور صورت واقعہ کا آئینہ بردار اور پورے طور سے مظہر ہے کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے مخصوص محلقین کے لیے تین مرتبہ دعائے رحمت کیوں کی؟ حضرتؐ نے فرمایا لم یشکوا۔

"اسلیے کہ انکے دلمیں شک کا گذر نہوا تھا"۔ (طبری ج ۳ ص)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک جماعت ایسی موجود تھی جسکے دل میں شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب اگر ہم تاریخ کے اندر یہ فقرات دیکھیں، دخل الناس من ذلک امر عظیم۔ "لوگوں کے دل میں امر عظیم داخل ہوا"۔ یا یہ کہ رسالتمآب نے کہا تحلیق کرو لیکن ما قام

منھمہ ہجلی۔ "کوئی شخص نہ ٹھہرا ہوا"
تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تاریخ کے الفاظ میں کوتاہی کی جھلک ہے اور استغفار
نظر انداز ہو گیا ہے۔ یا ابتدائے تخلیق کا حکم جس مجمع میں دیا گیا تھا اسمیں
وہی لوگ موجود تھے کہ جن کے دلوں میں تشکیک کا گذر تھا اور دوسرے
لوگ اس وقت موجود نہ تھے، اور رسالتمآبؐ نے ان کو خاص طور سے
حکم دینا ضروری نہ سمجھا تھا اس اطمینان پر کہ ان سے تو جب کہا
جائے گا یہ تخلیق کر ہی لیں گے۔

یہ سب صرف حقیقت حال کو واضح کرنے اور اس غلط فہمی کے
دفیعہ کے لیے ہے کہ اس شک وشبہہ میں تمام صحابہ کرام بلا استثناء
مبتلا ہو گئے اور کوئی شخص قائم و برقرار نہیں رہا معلوم ہوا کہ صورت واقعہ
اسکے خلاف ہے۔

بہرحال صلح ہو گئی اور رسالتمآبؐ نے صلح کی انتہائی جابرانہ شرائط
کو کفار سے منظور کر لیا، صرف اس بنا پر کہ اگر جنگ ہوتی تو مکہ فتح ہو جاتا
مگر یہ کہنے کو ہوتا کہ خود چڑھ کر آئے اور ہمارا شہر فتح کیا لہٰذا آپ نے
اس کا موقع نہیں دیا۔ آپ نے صلح کی اور اس کی پابندی اس حد
تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ سہیل (نمائندہ صلح)
کا لڑکا جو پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا زنجیروں میں گرفتار و المحمداہ و المحمداہ

گھسٹتا ہوا آیا اور اپنے تئیں رسولؐ کے سامنے ڈالدیا۔

سہیل نے جو دیکھا تو کھڑا ہوگیا، اُسے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لیچلا۔ رسالتمآبؐ خاموش دیکھتے رہے، اُس نے پکار کر آواز دی یا معشر المسلمین ارد الی المشرکین یفتنونی فی دینی۔ "کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین میں واپس کردیا جاؤنگا کہ وہ مجھ کو میرے دین سے منحرف کریں۔" حضرت نے کچھ تعرض نہ فرمایا بے شک دل پر اثر ضرور ہوا اور فرمایا یا ابا جندل احتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجا انا قد عقدنا بیننا وبین القوم عقدا وصلحا واعطیناھم علی ذلک واعطونا عھد ا وانا لا نغدر بھم۔

"اے ابو جندل صبر کر اس لیے کہ یہ چند دنوں کی تکلیف ہے۔ خدا تیرے لئے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں اپنی طرف سے کشایش پیدا کرے گا۔ ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک عہد کرلیا ہے۔ ایک پیمان ہوگیا ہے، ہم اُس کی مخالفت نہیں کرسکتے۔ (۱)

(یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آیندہ کی سیرتوں میں ایسے ہی

(۱) طبری ج ۳ صفحہ ۱۵۴۹

فقرے نظر سے گذرینگے۔

عہد نامہ مکمل ہو گیا۔ حضرتؐ نے اپنی طرف سے تو اس سختی کیساتھ پابندی کی مگر نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین کی طرف سے عہد شکنی شروع ہوئی۔

قبیلہ خزاعہ آپ کا حلیف ہوا تھا اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا جسکا تذکرہ سابق میں ہو چکا۔ ان دونوں قبیلوں میں پہلے سے عداوت تھی اس لیئے دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔ لیکن اب جس وقت کہ رسالتمآبؐ اور قریش کے درمیان عہد ہو گیا اور خزاعہ رسالتمآبؐ کے اور بنی بکر قریش کے حلیف ہو گئے اور یہ معاہدہ ہوا کہ آپس میں دس برس تک جنگ نہ ہوگی۔ تو اب خزاعہ کے لوگ مطمئن ہو گئے اسلحہ جسم سے اُتار ڈالے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں۔ یہ موقع بنی بکر کو غنیمت معلوم ہوا۔ ایک چشمہ پر جب کہ بنی خزاعہ کے لوگ وہاں مقیم تھے آکر اچانک طور سے حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔

قریش کے آدمیوں نے بھی ظاہری طور سے نہیں تو مخفی طور پر ان لوگوں کی امداد کی اور قبیلہ خزاعہ سخت نقصانات سے دوچار ہوا۔

عہد نامہ کے اصول کے مطابق قریش کا فرض تھا کہ وہ بنی بکر

اپنے حلفاء کو تنبیہ کرتے اور معاہدہ کے احترام پر مجبور کرتے۔ مگر قریش نے اور اُن کی تائید کی۔ قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا، اور رسالتمآبؐ کے سامنے جب کہ حضرت تمام لوگوں کے مجمع میں مسجد کے اندر رونق افروز تھے۔ اُس نے پہونچکر یہ اشعار پڑھنا شروع کیے۔

لاھمّ انی ناشد محمدا حلف ابینا وابیہ الاتلدا

"خداوندا میں یاد دلاتا ہوں محمد کو وہ پیمان محبت جو ہمارے اور اُن کے آبا و اجداد کے درمیان رہا کیا"

فوالدا کنا وکنت ولدا ثمت اسلمنا فلم ننزع یدا

"آپ ہمارے درمیان ہمارے بچوں کی طرح پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور بڑے ہوئے۔ پھر آپ نے دعوت اسلام دی تو ہم اسلام لائے اور آپ کی مخالفت نہیں کی"

فانصر رسول اللہ نصرا عتدا وادع عباد اللہ یاتوا مددا

"اس وقت مدد کیجئے اے خدا کے رسول مضبوط مدد اور خدا کے بندوں کو آواز دیجیے کہ وہ امداد کو آپ کی طرف مجتمع ہو جائیں"

فیھم رسول اللہ قد تجردا ابیض مثل البدر ینمی صعدا

"اس مجمع میں خدا کا رسول بے نقاب صورت سے اس طرح

نظر آئے جیسے ماہ شب چہاردہ وفور نور وضیا کے ساتھ۔

ان سیم خسفا وجہہ تربدا | فی فیلق کالبحر یجری مزبدا

"رسالتماب بیجا ظلم کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی ان کو ذلت پہونچانا چاہے تو غصہ سے اُن کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جائے اور وہ ایسے لشکر کے ساتھ چل کھڑے ہوں جو سمندر کی طرح بہ رہا ہو"

ان قریشا اخلفوک الموعدا | ونقضوا میثاقک المؤکدا

"اے خدا کے رسولؐ آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد خلافی کی اور آپ کے ساتھ جو پیمان ہوا تھا اُسکو توڑ دیا"

وجعلوا لی فی کداء رصدا | وزعموا ان لست ادعو احدا

"اُنھوں نے (بنی بکر نے) چشمہ کے کنارہ پر کمینگاہ سے ہمارے اوپر حملہ کر دیا کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ ہمارا کوئی فریاد رس نہیں ہے"

وھم اذل واقل عددا | ھم بیتونا بالوتیر ھجدا

فقتلونا رکعا وسجدا

"اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو بھلا اُن کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے، وہ تعداد میں بھی کم اور وجاہت کے اعتبار سے بھی بہت حقیر تھے، مگر ہم تو نماز شب میں مصروف تھے اُنھوں نے رکوع وسجود کی حالت میں ہمکو آکر قتل کیا"

یہ چیز ایسی تھی کہ اس کے بعد رسالتمآبؐ کا خاموش رہنا اخلاقی جرم تھا۔ رسالتمآبؐ نے اشعار سُنے ہی تھے کہ ایک مرتبہ فرمایا قد نصرت یا عمرو بن سالم" تمھاری مدد ہو گئی بس اے عمرو بن سالم" (یہ اُس شخص کا نام تھا جو قبیلہ خزاعہ کی طرف سے فریاد لے کر آیا تھا)

ایسا موقع جہاں کسی بات کو فوری حیثیت سے مخاطب تک پہونچانا ہو وہاں اُس کو الفاظ کے اُلٹ پھیر میں اُلجھانا اصول بلاغت کے خلاف ہے۔

ہو سکتا تھا کہ آپ فرماتے "کہ میں نے جو کچھ تم نے کہا وہ سُنا، ہم سے قریش سے عہد ہوا تھا اور اُس کی بنا پر جنگ ملتوی کر دی تھی، لیکن اب جس وقت کہ وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ہمارے حقوق کے پامال کرنے پر آمادہ ہیں تو ہمیں جنگ میں عذر نہیں۔ ہم لڑنے کے لیے تیار ہیں۔"

مگر اس وقت مخاطب کو ایک صبر آزما انتظار نتیجہ کے حصول میں سلسلۂ تقریر کے ختم ہونے کا کرنا پڑتا، جو کسی طرح خوشگوار نہیں ہو سکتا، اس لیے حضرتؐ نے بلا انتظار مخاطب کو اُس کی کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے مسافت کلام کو مختصر کیا اور ایکمرتبہ

اعلان فرما دیا کہ "اطمینان رکھو، تمھاری مدد ہو گئی"۔

اُسی وقت ایک ابر آسمان پر سامنے نمودار ہوا۔ حضرت نے فرمایا "یہ چمکتی ہوئی بجلی کا ابر بنی خزاعہ کی امداد کا مژدہ سُنانے آیا ہے"۔

اس کے بعد حضرتؐ نے فوج کشی فرمائی۔ اور نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح رواداری کا مظاہرہ ہوا! اُسوقت کی کمزوری! معلوم ہوتا تھا رسولؐ کے ساتھ کوئی فوج و لشکر نہیں۔ رسولؐ کے بازو میں طاقت ہی نہیں؛ اسطرح دب کے صلح کر لی۔

مگر حقیقۃً نہ وہ صلح کمزوری کی دلیل تھی اور نہ جنگ بے موقع غصہ و غضب کا نتیجہ۔ بلکہ دونوں صورتیں موقع شناسی کا مظاہرہ تھیں۔

(۲)

امیر المومنینؑ کا طرزِ عمل اور صلح و جنگ دونوں کا نقشہ

صفین کی صلح اور رواداری کی اعلیٰ مثال

جناب امیر علیہ السلام، اُن کا بھی طرزِ عمل سیرت رسولؐ کا آئینہ تھا۔ ہم اُس دور سے کنارہ کرتے ہوئے جو مسلمانوں کی بدقسمتی سے مناظرہ کا

مرکز بن گیا ہے، اُس دور پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جب باجماع مسلمین تخت خلافت آپ کے بائے نام ہو چکا تھا۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس سے قبل جو زمانہ گذرا ہے اُس میں، رواداری پر پورا عمل ہوا۔ اس کے قبل جنگ کی کوئی مثال ملتی ہی نہیں جس پر تبصرہ کیا جائے۔

سنہ ۳۵ھ میں جب مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی۔ اُسوقت ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے آپ سے بیعت نہیں کی جیسے اسامہ ابن زید۔ حسّان بن ثابت۔ عبداللہ بن عمر۔ سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ لیکن حضرت کی طرف سے اُن کے خلاف کوئی سختی نہیں ہوئی، نہ اُن کو بیعت پر مجبور کیا گیا۔ نہ اُنکو کسی طرح کی ایذا رسانی کی گئی۔

باوجودیکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی اُس میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں تھا۔ لیکن آپ نے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے کسی پر کوئی سختی کی ہو؟ تاریخ بتانے سے قاصر ہے۔

یہ رواداری کا قابل قدر نمونہ ہے۔

مگر جس وقت خاموشی میں حمایت باطل کا پہلو دیکھا یعنی جب شام کے تخت پر امیر معاویہ نے بحیثیت بادشاہ قبضہ رکھنے کا ارادہ کیا تو چونکہ آپ کے نقطۂ نظر سے اُن کا بطور گورنر کے باقی رکھنا باطل پروری کا الزام

اپنے اوپر عائد کرنا تھا(۱) اس لیے آپ نے خاموش رہنا جائز نہیں سمجھا۔
بے شک آپ نے اسامہ۔ حسان وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

(۱) ملاحظہ ہو شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ کی کتاب "السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ"
مطبوعہ مصر صـ۳ میں حسب ذیل روایات
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ولی من امر المسلمین شیئا فولّٰی رجلا وھو یجد من
ھو اصلح للمسلمین منہ فقد خان اللہ ورسولہ وفی روایۃ من قلد رجلا عملا علی
عصابۃ وھو یجد فی تلک العصابۃ ارضی منہ فقد خان اللہ وخان رسولہ و
خان المؤمنین رواہ الحاکم فی صحیحہ وروی بعضھم انہ من قول عمر لابن عمر روی
ذلک عنہ وقال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ من ولی من امر المسلمین شیئا
فولّٰی رجلا لمودۃ او قرابۃ بینھما فقد خان اللہ ورسولہ والمومنین " حضرت رسولؐ
نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا ذمہ دار ہو۔ پھر وہ اپنی جانب سے والی قرار دے کسی
شخص کو درانحالیکہ اُس سے بہتر شخص مسلمانوں کے مفاد کے لیے موجود ہے تو اُس نے خیانت
کی خدا اور اُسکے رسولؐ کی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جو شخص کسی آدمی کو کوئی منصب
عطا کرے کسی جماعت کے اندر، حالانکہ اُس جماعت میں اُس آدمی سے زیادہ
پسندیدہ شخص موجود ہے۔ تو اُس نے خدا اور اُس کے رسول اور تمام مومنین کی
خیانت کی۔ اس کو حاکم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اور بعض راویوں نے اس کو
حضرت عمر کی زبانی نقل کیا ہے۔ کہ انھوں نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا۔
حضرت عمر نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کا حاکم ہو کر کسی کو ذاتی محبت یا قرابت کی
بنا پر والی بنا دے تو اُس نے خدا اور اُس کے رسول، اور تمام مومنین کی خیانت
کی۔

اس لیے کہ وہ خانہ نشین تھے، اُن سے اعتراض کی ضرورت ہی کیا؟ وہ آپ کی سلطنت کے خلاف کوئی بغاوت تو کر ہی نہیں رہے تھے۔ رواداری کا اقتضا رہی یہ تھا کہ اُن کو چھوڑ دیا جائے۔ جب مذہب کے اصول میں یہ دستور ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" تو امامت و خلافت میں اکراہ کے کیا معنی؟

کوئی نہیں بیعت کرتا تو نہ سہی۔ نہ حق پر کوئی دھبّہ آئے گا اور نہ حق باطل ہو جائے گا۔ کوئی مستحق نہیں سمجھتا نہ سمجھے۔ آپ کیوں مجبور کیجیے۔

حضرتؑ نے اُن کے ساتھ تعرض نہیں کیا۔ لیکن ہاں امیر معاویہ کے لیے یہ گوارا نہیں کیا کہ شام کے تخت پر اُن کا قبضہ بحیثیت گورنر کے رہے جس کی ذمہ داری آپ کے اوپر آتی ہے۔

گو۔ لوگ آپ کو مشورہ بھی دیتے رہے کہ اگر آپ امیر شام کو تخت شام پر رہنے دیجیے تو کوئی شورش برپا نہ ہوگی، حضرت نے بھی اُنکے مشورہ کی اُن کے نقطۂ نظر سے تائید کی۔ یعنی یہ فرمایا کہ بے شک دنیاوی حیثیت سے ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو مگر میں حمایت باطل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتا۔

ابن عباس کا مشورہ تاریخ کے اندر موجود ہے۔ اُن کی رائے تھی کہ آپ امیر شام سے کوئی تعرض نہ کیجیے، اُن کو اس سے مطلب نہیں

کہ خلیفۃ المسلمین کون ہو۔ اُن کو صرف اس سے مطلب ہے کہ تخت شام اُنکے قبضہ میں رہے۔"

حضرت نے جواب دیا۔

واللّٰہ ما اشک ان ذلک خیر فی عاجل الدنیا لاصلاحھا واما الذی یلزمنی من الحق والمعرفۃ بعمال عثمان فواللّٰہ لا اولّی منھم احدا ابدا۔

"سیاست دنیا کے اعتبار سے تو بے شک ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو مگر حق کے اعتبار سے اور ان عمال حکومت کے اخلاق و عادات سے جس حد تک میں واقف ہوں اُس کے لحاظ سے میں کبھی ایک آن واحد کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ یہ میری جانب سے سر یر حکومت پر متمکن ہوں۔" (طبری ج ۵ صہ ۱۶۰)

دیکھیے وہی دونوں اصول ایک رواداری۔ دوسرے حمایت باطل سے علیحدگی۔ حضرت کے طرز عمل میں نمایاں ہیں۔ وہ جو آپ نے اسامہ بن زید کے ساتھ کیا۔ جو حسان بن ثابت کے ساتھ صورت عمل اختیار کی۔ جو عبداللہ بن عمر کے ساتھ برتاؤ کیا وہ رواداری کی مثال تھی۔ اور یہ جو امیر شام کے ساتھ طرز عمل اختیار ہو رہا ہے یہ حمایت باطل سے علیحدگی کا نتیجہ۔

لیکن اس کے بعد بھی آپ نے رواداری کے مسلک سے انحراف نہیں کیا۔

آپ نے معاویہ کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں کوئی تشدّد نہیں معلوم ہوتا، نہ لب ولہجہ میں کوئی تلخی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ پروانہ حکومت نہیں ہے، لیکن صاف طور سے معزولی کا پیغام بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر طرف مقابل میں رواداری کے عنصر کا کسی حد تک بھی وجود ہوتا تو یہ خط کسی طرح فتنہ وفساد کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا تھا۔

مشہور مورخ اسلام واقدی کی کتاب الجمل میں اس خط کا مضمون حسب ذیل ہے۔

من عبد اللہ علیؑ امیر المومنین الی معاویۃ بن ابی سفیان، اما بعد فقد علمت اعذاری فیکم واعراضی عنکم حتی کان ما لا بد منہ ولا دفع لہ والحدیث طویل والکلام کثیر وقد ادبر ما ادبر واقبل ما اقبل فبایع من قبلک واقبل الی فی وفد من اصحابک۔

"تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کی خلافت قبول کرنے میں حجت تمام کر دی اور پوری بے توجہی کا اظہار کیا۔ مگر وہ ہوا کہ جو ہونے والا تھا، اور جس سے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

بہر حال قصہ طولانی ہے اور باتیں بہت۔ جو کچھ ہو چکنے والا تھا وہ ہو چکا اور جو صورتیں پیش آنے والی ہیں وہ پیش ہیں۔ تم کو چاہیے کہ تمام رعایائے شام سے میری بیعت حاصل کرو اور اپنے اہل مملکت کے ایک منتخبہ وفد کے ساتھ میرے پاس آؤ۔" (نہج البلاغہ ج ۲ مطبوعہ مصر ص۴)

یہی پہلا خط ہے جسنے پہونچتے ہی مخالفت کی آگ مشتعل کر دی۔

میں پھر دنیا کو متوجہ کرتا ہوں اور فیصلہ چاہتا ہوں کہ اس خط کے اندر کون لفظ رواداری کے خلاف ہے۔

بیشک آپ کا مقصد یہی تھا کہ آپ حکومت سے معزول کریں۔

لیکن خط کے الفاظ بہر صورت رواداراںہ ہیں۔

اس کے بعد جو صورت پیش آئی وہ دنیا کو معلوم ہے۔ آپ پر قتل عثمان کا الزام عائد کیا اور ایک طوفان مخالفت کا آپ کے خلاف بر پا کر دیا گیا۔

حضرت عثمان کا خون بھرا قمیص اور انکی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں سال بھر تک دمشق کے منبر پر آویزاں رہیں۔ جس کے گرد ہزاروں آدمی نوحہ و ماتم کرتے تھے۔ (طبری ج ۵ ص ۲۳۵)

اس طرح مخالفت کے جذبات کو علیؑ کے خلاف مشتعل کیا گیا۔
فوج کشی ہوئی اور آپ سے جنگ کی تیاری کی گئی۔

اس کے بعد بھی حضرت نے متعدد خطوط کے ذریعہ سے فہمائش کی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور جنگ کی صورت نہ پیدا ہو۔ لیکن اس رواداراانہ طریقہ کا جواب تشدد پسندانہ طرز عمل سے ملا۔

آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا کہ کسی صورت سے معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ لڑائی ٹھنی اور بہت بڑی فوج آپ سے مقابلہ کیلیے میدان کارزار میں آگئی۔ اب ملاحظہ فرمایئے ایک طرف ایک بادشاہ ہے جو تمام مسلمانوں کے اتفاق آراء سے خلیفہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جس کی حیثیت اس کے قبل ایک گورنر کی تھی اور اب ایک باغی کی حیثیت سے میدان میں آیا ہے۔ لیکن شاہانہ گھمنڈ، سخن پروری، خودداری کے بجائے صرف رواداری کے خیال سے حضرت علیؑ خود اپنی جانب سے نامہ و پیام اور گفتگوئے صلح کی ابتداء کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح معاملہ طے ہو جائے۔

آپ نے تین آدمیوں کو بطور وفد منتخب کیا۔ بشیر بن عمرو بن محصن انصاری۔ سعید بن قیس ہمدانی۔ شبث بن ربعی تمیمی۔ اور ان لوگوں کو معاویہ سے گفتگو کے روانہ کیا۔ فرمایا جاؤ اور دعوت دو اتفاق و اتحاد اور اطاعت و اجتماع کی طرف۔"

یہ لوگ گئے مگر جواب کیا ملا؟ یہ کہ انصرفوا من عندی فانہ لیس بینی و بینکم الا السیف۔ "پلٹ جاؤ میرے پاس سے، کیونکہ میرے تمھارے درمیان میں بس تلوار فیصلہ کن ثابت ہوگی" (طبری ج ۶ ص ۲۴۳)

واقعہ یہ ہے کہ روادارانہ طرز عمل سے (جب کہ طرف مقابل بلند ظرف نہ ہو) یہ خیال قائم ہوجاتا ہے کہ ہمارا مقابل دب گیا۔ اس لیے تشدد میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد جنگ کا دن آیا۔ صف آرائی ہوئی اور طرفین کی فوجیں باہم گر مقابل ہوئیں۔ لیکن امیر المومنینؑ کی یہ تاکید کہ ہماری طرف سے جنگ شروع نہ ہو، چنانچہ اُسی طرف سے حملہ کی ابتدا ہوئی اور جنگ چھڑ گئی جس کا سلسلہ طویل عرصہ تک قائم رہا، اور اس درمیان میں بھی حضرتؑ کی طرف سے موعظہ و ہدایت اور نصیحت و فہمائش کا سلسلہ جاری رہا، جس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہوا۔ اور آخر سب سے آخری لڑائی ہوئی جس کا سلسلہ رات تک رہا اور پھر بھی موقوف نہ ہوا۔ "لیلۃ الہریر" کی جنگ صبح ہوتے ہوتے شام کی فوج کا ستھراؤ ہوگیا، اور بقیہ جماعت کے قدم اُٹھ چلے، اور اب امیر شام کو ضرورت محسوس ہوئی کہ جنگ موقوف کیجائے تاکہ وہ انتہائی شکست جس کی توقع بہت قریب تھی ہونے نہ پائے اس لیے قرآن کو نیزوں پر بلند کیا گیا، اور آواز دی گئی کہ ھذا

کتاب اللہ عزوجل بیننا وبینکم من لثغور اهل الشام بعد اهل الشام ومن لثغور اهل العراق بعد اهل العراق۔

"بھائیو! یہ کتاب خدا ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کریگی۔ شام والے سب ہلاک ہوگئے۔ پھر شام کے حدود کی کون حفاظت کرے گا۔ اور عراق والے بھی ہلاک ہوگئے، پھر عراق کے حدود کا کون مالک ہوگا۔ (۱)

امیر المومنینؑ پہلے ہی کتاب خدا کی طرف دعوت دے چکے تھے۔ جیسا کہ آپ کی اُس تقریر میں ہے جو آپ نے نمائندگان شام حبیب بن مسلم فہری و شرحبیل بن سمط و معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی۔ اُس میں آپ نے کہا تھا۔ الا انی ادعوکم الی کتاب اللہ عزوجل وسنۃ نبیہ واماتۃ الباطل واحیاء معالم الدین

"میں تم لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کتاب خدا اور سُنت رسولؐ اور باطل کو پامال کرنے حق کو زندہ کرنے کیجانب۔" (۲)

لیکن اُس وقت آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی۔ اب جب وقت کہ جنگ کا آخری نتیجہ اپنی بھیانک شکل میں اہل شام کے سامنے ہے تو اب وہ کتاب خدا کی طرف دعوت کی آواز بلند کرتے ہیں۔ جس سے

(۱) طبری ج ۶ صـ۲۶ ۔ (۲) طبری ج ۶ صـ۴

صاف ظاہر ہے کہ نہ اسمیں سچائی ہے اور نہ حقانیت۔

اس لیے امیر المومنینؑ کا اس وقت خوشی کے ساتھ اس دعوت کو منظور کر لینا اور جنگ کو اس آخری فیصلہ کن نتیجہ کے قریب پہونچ کر ختم کر دینا اپنے تئیں دشمن کے ہاتھ سے بیوقوف بننے دینا تھا۔ چنانچہ حضرت نے جنگ جاری رکھنے کا ارادہ کیا، اور اس بے وقت کی تحریک التوائے جنگ پر رضامندی ظاہر نہ فرمائی، مگر کوفہ کی منافق جماعت نے جو آپ کے لشکر میں داخل تھی فتنہ و فساد برپا کیا اور یہ کہا کہ ہم قرآن کے سامنے کسی طرح ہاتھ نہ اٹھائیں گے۔ اور قرآن نیزوں پر بلند ہو جانے کے بعد کسیطرح جنگ نہ ہونے دینگے۔

امیر المومنینؑ نے ملاحظہ فرمایا کہ اب ایک دوسرا فتنہ کھڑا ہو رہا ہے، اس لیے آپ نے سکوت اختیار کیا، اور جنگ ملتوی ہو گئی۔ دو شخص طرفین کی جانب سے حکم مقرر کیے جانے لگے، کہ وہ قرآن مجید پر نظر ڈال کر حقیت کا فیصلہ کریں۔

شام کے لوگوں نے عمرو بن عاص کو معین کیا۔ بے شک انصاف کا اقتضا یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کو بھی حق دیا جاتا کہ کسی ایسے شخص کو معین فرمائیں جس پر آپ کو کامل اعتماد ہو، اور اس لحاظ سے آپ نے اپنی جانب سے عبد اللہ بن عباس اور پھر مالک اشتر کا نام پیش فرمایا

مگر بے انصاف ساتھ والے افراد نے کہا کہ یہ لوگ تو آپ کے ساتھ "یک جان و دو قالب" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ہرگز ایسے اشخاص کو حکم بنانے پر تیار نہیں، بلکہ ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنائیں گے جو جنگ کے معاملہ میں غیر جانبدار رہے ہیں۔ حضرت نے انتہائی کبیدگی سے فرمایا کہ "اچھا جو تمھارا جی چاہے کرو۔ مجھ سے مطلب نہیں۔"

صلحنامہ لکھا جانے لگا۔ حدیبیہ کا واقعہ آپ کے پیش نظر ہوگا۔ ملاحظہ ہو کہ کس طرح صورتیں ملتی جلتی ہوئی ہیں۔

امیر المومنینؑ نے صلحنامہ لکھوانا شروع کیا فرمایا لکھو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما تقاضی علیہ علی امیر المومنین۔

"یہ وہ ہے جس پر صلح کی علی امیر المومنینؑ نے" (جیسے وہاں لکھا گیا ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ) عمرو بن عاص نے لکھنے والے سے کہا۔ اکتب اسمہ واسم ابیہ ھو امیرکم فاما امیرنا فلا۔

"ان کا اور ان کے باپ کا بس نام لکھو۔ وہ تمھارے امیر ہوں گے۔ ہم نے انھیں امیر تھوڑی ہی تسلیم کیا ہے؟"

تھوڑی دیر تک تو اس میں تردد و تذبذب رہا۔ لیکن آخر حضرت نے فرمایا کہ "امیر المومنین" کی لفظ محو کردو اور فرمایا۔ اللہ اکبر سنۃ بسنۃ و مثل بمثل واللہ انی لکاتب بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم یوم الحدیبیة اذ قالوا الست رسول اللہ ولا نشھد لک بہ ولکن اکتب اسمک واسم ابیک فکتبہ۔

"اللہ اکبر! یہی واقعہ ہو بہو پہلے بھی پیش ہو چکا ہے۔ حدیبیہ میں میں ہی رسالتمآبؐ کے سامنے صلحنامہ لکھ رہا تھا جب اُن لوگوں نے کہا کہ ہم آپکے "رسول اللہ" ہونے کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہذا آپ بس اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے۔ حضرتؐ نے یہی لکھوایا۔ اور "رسول اللہ" تحریر نہیں کیا۔ اُسکے بعد کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

قاضی علی علی اھل الکوفة ومن معھم من شیعتھم من المؤمنین والمسلمین وقاضی معاویة علی اھل الشام ومن کان معھم من المؤمنین والمسلمین انا ننزل عند حکم اللہ عزوجل وکتابہ ولا یجمع بیننا غیرہ وان کتاب اللہ عزوجل بیننا من فاتحتہ الی خاتمتہ نحیی ما احیا ونمیت ما امات فما وجد الحکمان فی کتاب اللہ عزوجل وھما ابوموسی الاشعری عبد اللہ بن قیس وعمرو بن العاص القرشی عملا بہ وما لم یجدا فی کتاب اللہ عزوجل فالسنة العادلة الجامعة غیر المفرقة۔

"علی بن ابی طالب ذمہ داری لیتے ہیں اہل کوفہ اور دیگر اُن لوگوں کی جو اُن کے ساتھ ہیں مسلمانوں میں سے، اور معاویہ نے ذمہ داری

لی ہے۔ اہل شام اور دیگر اُن اشخاص کی جو اُن کی طرف ہیں اس قرارداد
کے اوپر کہ ہم خدا اور اُس کی کتاب کے فیصلہ پر دار و مدار رکھتے ہیں۔
اور سوائے کتاب خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کُن نہیں ہے، اور خدا کی
کتاب ہمارے سامنے رہے گی شروع سے لے کر آخر تک۔ ہم زندہ کرینگے
اُسی بات کو جسے کتاب خدا زندہ کرے، اور مُردہ کریں گے اُس کو جسے
کتاب خدا مُردہ کرے۔ طرفین کے حکم کتاب خدا پر نظر ڈالیں گے اور جو کچھ
کتاب خدا سے ثابت ہو اُس پر عمل کریں گے اور اگر بعد بحث و تذکرہ
اور تبادلۂ خیالات کتاب خدا میں کچھ نظر نہ آئے تو رسالتمآب کی متفقہ سنت
پر جسمیں اختلاف و افتراق نہ ہو عمل کیا جائیگا۔"

اس کے بعد دوسرے جزئی شرائط ہیں جو امن و امان اور اجتماع
حکمین وغیرہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس معاہدہ سے صاف ظاہر
ہے کہ حضرت نے حقیقۃً کتاب الٰہی کو حکم قرار دیا تھا اور یہ کوئی تازہ بات
نہ تھی جس کے آپ اس تحریر کی وجہ سے پابند ہوئے ہوں، بلکہ ہر وقت
ہی آپ کتاب خدا کے فیصلہ کیلیے تیار تھے۔

حکمین کا ذاتی فیصلہ جو کتاب خدا کی بنیاد پر نہ ہو کسی طرح اس قرارداد
صلح کی رو سے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ آپ نے خود حکمین سے جو
فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے صاف طور سے ارشاد فرمایا تھا۔ (حکما

علیٰ ان تحکما بکتاب اللہ وکتاب اللہ کلہ معی فان لم تحکما بکتاب اللہ فلا حکومۃ لکما۔

"تم حکم ہو مگر اس شرط سے کہ کتاب اللہ کے رو سے فیصلہ کرنا اور یہ یقینی ہے کہ کتاب خدا کل کی کل میرے ساتھ ہے۔ اگر تم کتاب خدا کی رو سے فیصلہ نہ کرو تو تمھاری حکومت تسلیم نہیں ہو سکتی۔

(اسد الغابہ۔ ابن اثیر جزری۔ ج ۳ صـ ۲۴۶)

یہی جزو تھا جس کے ساتھ حضرت نے "رواداری و امن پسندی" کے ساتھ "حق پروری اور حمایت باطل سے علیحدگی" کے عنصر کو محفوظ رکھا۔

صلح ہو گئی۔ معاہدہ مکمل ہوا۔ مگر تمام طبیعتیں اُس سے راضی ہو تیں ناممکن، ایک جماعت ایسی تھی جو برافروختہ ہو گئی۔ کہا "یہ صلح ذلت کی صلح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علی بن ابی طالبؑ خود اپنی حقیت میں شک رکھتے ہیں۔ لاحکم الا للہ۔ "حاکم سوائے خدا کے کوئی نہیں"۔

اس بنیاد پر خوارج کے مذہب کی عمارت قائم ہوئی۔

صلح ہونا۔ مخالفت ہونا۔ لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہونا۔ یہ تمام صورتیں ہیں جو حدیبیہ میں ہمارے سامنے تھیں وہی یہاں بھی پیش نظر ہوئیں۔

پھر جس طرح وہاں رسالتمآبؐ نے خلاف ورزی معاہدہ سے یہ کہکر انکار فرمایا تھا کہ ہم نے عہد کیا ہے اُس کی مخالفت نہیں کرینگے اسیطرح

امیرالمومنین سے تحریک کی گئی کہ چلیے ہم آپ کے ساتھ ہیں، امیر شام سے جنگ کیجیے، تو آپ نے وہی لفظیں ارشاد فرمائیں۔

ملاحظہ ہو حضرت کی گفتگو، زرعہ بن برج طائی اور حرقوص بن زہیر سعدی سے جس میں حضرت نے ان دونوں کے جواب میں فرمایا ہے۔ قد کتبنا بیننا وبینھم کتابا وشرطنا شروطا واعطینا علیھا عھودنا ومواثیقنا وقد قال اللہ عزوجل واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ما تفعلون۔

"ہم نے نوشتہ دیدیا ہے، شرائط قرار دیے ہیں، عہد و میثاق کر لیا ہے۔ اب اُس کی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور نہ توڑو اپنی قسم کو جب کہ تم نے اُسے مضبوط کر دیا ہے اور خدا کو اُس کا ضامن بنا دیا ہے۔ اور یقیناً خدا تمھارے افعال و اعمال پر مطلع ہے۔"

معاہدہ میں رواداری اور اُس کے بعد پابندی اور سختی کے ساتھ پابندی مگر کب تک؟ جب تک کہ فریق مخالف کی طرف سے شرائط معاہدہ پر عمل ہو۔ لیکن وہاں صورت حال کیا نمایاں ہوئی؟ یہ کہ حکمین کے فیصلہ کو جس معیار پر مبنی قرار دیا گیا تھا وہ نہیں ہوا۔ نہ کتاب خدا سے کوئی مطلب

رکھا گیا، نہ اس میں نظر و فکر کی ضرورت سمجھی گئی، بلکہ حکمین نے خود آپس میں ایک سمجھوتہ کر کے اس پر متفق ہونے کی سازش کی، اور پھر وہ بھی ناکام رہی اور اختلاف کا اختلاف ہی قائم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابو موسیٰ بھولے بھالے آدمی تھے اور امیر المومنینؑ سے کوئی خاص خلوص بھی نہ رکھتے تھے، اور عمرو عاص سمجھدار چالاک جاندار و آزمودہ کار، اور پھر امیر معاویہ کے خیر خواہ و وفادار بلکہ روح و رواں اور یک جان و دو قالب۔ جب زمانہ حکمین کے اجتماع کا قریب پہونچا تو ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص دونوں آدمی مقام دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے درمیان بالکل وسط میں واقع تھا، اور یہیں اجتماع کی قرارداد ہوئی تھی، مجتمع ہو گئے۔ روزانہ ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ عمرو نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں، اور یہ کہیں کہ آپ بزرگ ہیں اور رسالتمآبؐ کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں، آپ پہلے تقریر کیجئے پھر میں کہونگا۔

اس طرح عمرو عاص نے ابو موسیٰ اشعری پر اپنی ادب شناسی کا اثر قائم کیا، اور اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ مسئلہ متنازع فیہ کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا اور رائے یہ قرار دی گئی کہ دونوں طرف کے حکم دونوں طرف کے امیروں کو معزول کر دیں۔ یعنی معاویہ تخت شام سے، اور

امیر المومنین تخت عراق و حجاز سے دونوں شخص علیحدہ ہو جائیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ از سر نو جس شخص کو چاہیں منتخب کر لیں۔"

ابو موسیٰ اور عمرو عاص نے اس رائے کو آپس میں مشورہ کر کے طے کیا، اور جب فیصلہ کا وقت آیا، اور طرفین کے لوگ فیصلہ سننے کو مجتمع ہوئے، عمرو عاص نے حسب عادت ابو موسیٰ اشعری سے کہا، "بسم اللہ فرمایئے جو کچھ آپ کی رائے ہے"۔ ابو موسیٰ کی عادت تو پہلے سے پڑی ہوئی تھی ہی تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے اور خیال نہ کیا کہ اس میں کوئی بات نہ ہو باوجودیکہ عبداللہ بن عباس جو سمجھدار شخص تھے، انھوں نے کہا بھی ابو موسیٰ سے کہ دیکھیو عمرو عاص نے تمھیں کہیں فریب نہ دیا ہو۔ پہلے عمرو عاص کو تقریر کر لینے دو پھر تم تقریر کرنا۔ مگر ابو موسیٰ نے کہا کہ نہیں ہم متفق ہو چکے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے"۔ اس کے بعد کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے کہ "ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد بہترین رائے جو قرار دی ہے جس میں افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دونوں آدمی علی و معاویہ دونوں کو معزول کریں اور مسئلہ خلافت کو از سر نو مسلمانوں کے انتخاب کے حوالہ کر دیں کہ جسے وہ چاہیں منتخب کر لیں"۔

ابو موسیٰ نے یہ تقریر کی اور بیٹھ گئے۔ عمرو عاص کی باری آئی، وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

"حضرات! آپ لوگوں نے ابوموسیٰ کی تقریر سُنی۔ انھوں نے نمائندہ علیؑ ہونے کی حیثیت سے علیؑ کو معزول کر دیا۔ میں امیر شام کا نمائندہ ہوں میں بھی علیؑ کی معزولی سے متفق ہوں، مگر امیر شام کو برقرار کرتا ہوں۔"

ابوموسیٰ برافروختہ ہوگئے، کہنے لگے

مالک لا وفقک اللہ غدرت وفجرت انما مثلک کمثل الکلب

ان تحمل علیہ یلہث او تترکہ یلہث

"یہ تونے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، تونے غداری کی۔ بے ایمانی کی۔ تو کُتّے کی طرح ہے کہ چاہے اُس پر حملہ کر دو یا اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو وہ بھونکنے سے باز نہ آئیگا۔"

عمروعاص نے جواب دیا۔

انما مثلک کمثل الحمار یحمل اسفارا۔

"تمھاری مثال گدھے کی ہے جسکی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔"

جلسہ انہی تہذیب و اخلاق کے مظاہروں پر ختم ہوگیا۔ قریب تھا کہ کشت وخون کی نوبت آجائے۔ لیکن غنیمت یہ ہے کہ مجمع اسی افتراق و پراگندگی کے ساتھ منتشر ہوگیا اور زبانی جنگ سے آگے نہیں بڑھا۔

قرارداد یہ تھی کہ کتاب خدا پر نظر ڈالی جائے گی۔ بحث وفحص کے بعد جس بات پر دونوں طرف کے حکم متفق ہوں گے وہ عمل میں لائی جائیگی

مگر اتفاق کی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی بھی فریق اس فیصلہ کو جائز نہیں سمجھتا ہے۔ اور شیعہ ہوں یا سُنی کوئی مخالف نہیں ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ فیصلہ کھلونا بن کر رہ گیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرات اہلسنت امیر معاویہ کی خلافت کا امام حسنؑ کی صلح سے حساب کرتے ہیں اس سے قبل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اگر یہ فیصلہ ناطق ہوتا تو اُسیوقت سے خلافت امیر معاویہ کی تسلیم کر لیجاتی۔

اس صورت حال کے معنی یہ تھے کہ معاہدہ کے دفعات پامال ہو گئے اور قرارداد صلح کے حدود ختم ہو گئے۔ اس لیے امیر المومنینؑ پھر جنگ پر آمادہ ہوئے اور فوج کی تیاری کا حکم دیا۔

بہر حال وہی طرزِ عمل کہ کبھی صلح اور کبھی جنگ۔ جنگ کا موقع ہوتا ہے تو ہمت و جرأت سب کا مظاہرہ اعلیٰ شان سے۔ اور صلح کا موقع ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بازوؤں میں طاقت اور دل میں جوش پیدا ہی نہیں ہوا ہے ہے

(۱۴)

فرزند رسولؐ حضرت امام حسنؑ مجتبیٰ

امن پسندی و رواداری کے ساتھ

حق کی حمایت کا اعلیٰ مظاہرہ

رسولؐ کا زمانہ منقضی ہو چکا۔ امیر المومنینؑ کا دور بھی ختم ہوا۔ اب وقت ہے فرزندان رسولؐ یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا۔ امام حسنؑ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا خون بہت بہہ چکا ہے۔ معاملات حد سے زیادہ طول پکڑ چکے ہیں اور پیمانہ تحمل لبریز ہو چکا ہے۔ مسلمانوں میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اب زیادہ زمانہ تک خونریزی کے نتائج کو برداشت کریں آپ نے صلح کی۔ صلح کے شرائط قرار پائے اور میں اُن شرائط صلح کو یہ دکھلانے کے لیے پیش کرنا ضروری سمجھوں گا کہ آپ نے امن پسندی کے مقصد کے لیے حمایت باطل سے علیحدگی کے پہلو کو ترک نہیں کر دیا تھا بلکہ اس پہلو کی کامل حفاظت فرمائی ہے۔

یہ امام حسنؑ کا طرزِ عمل یعنی صلح ایسا ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان اُس کے حق بجانب ہونے پر متفق ہیں۔ شیعہ ! وہ تو بہرحال

یہ کہتے ہیں کہ امام کا طرز عمل ہے، لہذا وہ حق بجانب ہے۔

معصوم سے کسی غلطی کا ہونا ممکن نہیں۔ آپ نے صلح کی تو موقع تھا صلح کا جب ہی صلح فرمائی۔ حضرات اہلسنت بھی اس امر سے اتفاق رکھتے ہیں اور جامع حدیث میں ایک حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ امام حسنؑ کے متعلق کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا تھا۔ ابنی ھذا سیّد یصلح اللہ بہ بین فئتین من المسلمین۔" یہ میرا بیٹا سید و سردار ہے خدا اسکے ذریعہ سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائیگا۔

لیکن یہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں جو اس صلح کی پسندیدگی پر اتفاق رکھتے ہیں۔ مگر اُس زمانہ میں کہ جب صلح واقع ہوئی تھی وہی صورتیں نظر آرہی تھیں جو رسالتمآبؐ کی صلح میں پیش آئیں۔ اور امیرالمومنینؑ کی صلح میں رونما ہوئیں۔

ایک بہت بڑی جماعت خلاف ہوگئی اور اُس نے کہا کہ آپ نے کمزوری سے صلح کر لی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ آپ کو السلام علیک یا مذل المومنین کے الفاظ سے سلام کیا گیا۔

جس طرح رسالتمآبؐ سے کہا گیا تھا۔ الست رسول اللہ۔ فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا۔" کیا آپ خدا کے رسول نہیں ہیں۔ پھر آخر ہم ذلت کو اپنے مذہب کی کس لئے برداشت کریں"۔

رسولؐ کی صلح کو اسلام اور مسلمانوں کی ذلت قرار دیا جا رہا تھا، اُسی طرح حسن مجتبیٰؑ کی صلح کو تمام مسلمانوں کی ذلت سے تعبیر کیا گیا، اور یہ کہا گیا کہ۔

"سلام ہو آپ پر اے تمام مومنین کے باعث ذلت ہونے والے"۔
لیکن وہ رواداری کی طاقت تھی کہ ان تمام باتوں پر بھی کچھ اعتنا نہ کی ان تمام چیزوں کو برداشت کیا لیکن صلح پسندی سے نہ ہٹے۔
بے شک شرائط صلح میں اس بات کا خیال رکھا کہ حمایت باطل کا پہلو بھی پیدا نہ ہو اور ضلالت و گمراہی کی اشاعت کی بھی اپنے اوپر ذمہ داری نہ عائد ہو۔

صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی[1] میں جو صلحنامہ کا مضمون درج ہے، وہ حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما صالح علیہ الحسن بن علی معاویۃ بن ابی سفیان صالحہ علیٰ ان یسلم الیہ ولایۃ المسلمین۔ (شیعوں کے عقیدہ میں "امامت" جو چیز ہے وہ نفسانی صفات کا نتیجہ اور خدا کی طرف کا منصب ہے۔ وہ انسان کیساتھ خدا کی مخصوص کی ہوئی ایک بات ہے جو الگ نہیں کیجا سکتی۔ ایک عالم کا

(۱) مطبوعہ مصر صـ۱۳۰

علم جس طرح اس قابل نہیں کہ بیع ہو سکے، شراء ہو سکے، اور ایک نبی کی نبوت، رسول کی رسالت بیع و شراء کی صلاحیت نہیں رکھتی اسیطرح امامت ایک نفسانی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ قابل انتقال نہیں ہے۔ اور نہ عہد یا صلح کے ذریعہ سے وہ ایک سے دوسرے کی طرف جاسکتی ہی بے شک، ظاہری حکومت وہ امامت سے جداگانہ چیز ہے جو امامت کی بنا پر ایک امام کا حق ہے۔ یہ حق منتقل بھی ہو سکتا ہے اور اس کے متعلق عہد و صلح، پیمان و قرار داد کا موقع بھی ہے۔ اُس کا رہنا یا منتقل ہو جانا امامت میں کسی تفریق کا باعث نہیں ہے جس طرح ظاہری سلطنت کی موجودگی میں امام امام ہے، اُسی طرح سلطنت سے علیحدہ ہونے پر بھی امام کی امامت باقی ہے)

صلح یہ ہوئی ہے کہ حسن بن علی مسلمانوں کی حکومت کو معاویہ بن ابی سفیان کے سپرد کر دیں" لیکن سپرد کیونکر کریں۔ اس لیے کہ حمایت باطل کرنا منظور نہیں۔ اس لیے یہ شرط قرار دی گئی کہ۔ علی ان یعمل فیھا بکتاب اللہ تعالیٰ و سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سیرۃ الخلفاء الراشدین المھدیین ولیس لمعاویۃ بن ابی سفیان ان یعہد الی احد من بعدہ عہدا بل یکون الامر من بعدہ شوریٰ بین المسلمین وعلی ان الناس اٰمنون حیث کانوا من

ارضِ اللہ تعالیٰ فی شامھم و عراقھم و حجازھم و یمنھم و علی ان اصحاب علیؓ و شیعتہ اٰمنون علی انفسھم و اموالھم و نساءھم و اولادھم حیث کانوا وعلی معاویۃ بن ابی سفیان بذلک عہد اللہ ومیثاقہ وان لا یبتغی للحسن بن علی ولا لاخیہ الحسین ولا لاحد من بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غائلۃ سرا ولا جہرا ولا یخیف احدا منھم فی افق من الآفاق۔

اس شرط پر کہ امیر معاویہ مسلمانوں کے درمیان کتاب خدا پر عمل کریں، اور سنت رسول اللہؐ کا اجرا کریں، اور صحیح راستہ پر چلنے والے ہدایت یافتہ خلفاء کی جو سیرت ہونا چاہیے اُس کے پابند رہیں اور معاویہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے بعد کسی کو بھی جانشینی کے لیے نامزد کریں، اور ولی عہد قرار دیں بلکہ یہ امر اُن کے بعد مسلمانوں کے شوریٰ پر موقوف ہوگا، اور یہ کہ تمام لوگ امن و امان میں رہیں گے۔ شام، حجاز، عراق۔ یمن جس جگہ بھی خدا کی زمین میں وہ بس گئے ہوں، اور علیؓ کے اصحاب اور اُن کے شیعہ بھی اپنے جان، مال، ناموس، اولاد ہر حیثیت سے مامون و محفوظ رکھے جائیں گے جس جگہ بھی اُن کا قیام ہو۔ یہ عہد ہے جو خدا کی طرف سے معاویہ کے اوپر عائد ہے۔ اور معاویہ کسی وقت میں بھی امام حسنؑ یا اُن کے بھائی امام حسینؑ یا اہلبیت

رسولؐ میں سے کسی اور شخص کے قتل کی ریشہ دوانی نہ کریں گے۔ خفیہ طور سے اور نہ علانیہ اور نہ کسی وقت میں اُن کو قتل کی دھمکی دیں گے۔ اور نہ خوف و دہشت کے باعث ہوں گے۔

یہ تھے شرائط صلح جن پر طرفین کا اتفاق ہوا۔

جس طرح امام حسنؑ اس صلح پر رضا مند تھے، اُسی طرح آپ کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ بھی اس سے متفق تھے، اور اُن کی رائے بھی حالات وقت کو دیکھتے ہوئے امام حسنؑ کی رائے سے متحد تھی۔ شیعوں کے عقائد کے لحاظ سے تو معصومین کی رایوں میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں تو تاریخی حیثیت سے کلام کر رہا ہوں۔ اس حیثیت سے بھی یہ حقیقت ثابت ہے کہ امام حسنؑ نے جو صلح کی ہے تو امام حسینؑ بھی اُس سے متفق تھے۔

چنانچہ میرے پیش نظر ہے "تاریخ الاخبار الطوال" یہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری کی تصنیف ہے جن کی وفات ۲۸۱ھ میں ہوئی ہے۔ یہ طبری کے معاصر اور ایک حیثیت سے اُن سے مقدم ہیں۔ اس لیے کہ طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہے۔

یہ تاریخ مصر میں چھپی ہے اور وہاں کے جامع ازہر کے مدرس علم تاریخ شیخ محمد خضری مشہور مصنف تاریخ خضری کے حواشی اور توضیحات کے ساتھ ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

یہ کتاب میرے سامنے ہے اور اُس میں لکھا ہے کہ حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمر جو صلح امام حسنؑ کے مسئلہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا۔ ابا عبد اللہ شریتم الذّل بالعزّ وقبلتم القلیل وترکتم الکثیر اطعنا الیوم واعصنا الدّھر دع الحسن وما رأی من ھذا الصّلح واجمع الیک شیعتک من اھل الکوفۃ وغیرھا وولنی وصاحبی ھذہ المقدمۃ فلا یشعر ابن ھند الا ونحن نقارعہ بالسیوف۔

دیکھیے وہ ایسے الفاظ میں گفتگو کر رہے ہیں جو ہر ایسے انسان کے جوش کو موجزن کر دیں جس کے اقدامات جذبات کے ماتحت ہوتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں "اے ابوعبداللہ آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ آپ نے کم حقوق حاصل کر کے بہت سے اپنے حقوق سے دستکشی کر لی۔ اچھا اب آپ آج ہماری بات مان لیجیے۔ چاہے پھر کبھی نہ مانیے گا۔ آپ امام حسنؑ کو چھوڑ دیجیے اُس مسلک پر صلح پسندی کے جو اُنھوں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جمع کیجیے جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر۔ اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ بس امیر شام کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم تلواروں سے حملے کرتے ہوئے نظر آئیں"

حضرت نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے۔ قول و قرار کر چکے۔ اب عہد شکنی ممکن نہیں۔ اور ملاحظہ ہو علی بن محمد بن بشیر ہمدانی۔ یہ بھی اسی جماعت

میں سے ہیں جو صلح پر معترض تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلی کی معیت میں مدینہ پہونچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اُس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔

میں نے کہا السلام علیك یا مذل المؤمنین۔ آپؑ نے اس طرح کے سلام کا جواب بھی ضروری سمجھا اور فرمایا۔ وعلیك السلام اجلس لست مذل المومنین ولکنی معزھم ما اردت بمصالحتی معاویۃ الا ان ادفع عنکم القتل عند ما رائت من تباطئ اصحابی عن الحرب ونکولھم عن القتال واللہ لئن سرنا الیہ بالجبال والشجر ماکان بد من افضاء ھذا الامر الیہ۔" تم پر بھی سلام ہو بیٹھو میں مومنین کی ذلت کا باعث ہونے والا نہیں ہوں میں تو انکی عزت کا خواہاں ہوں۔ مجھے تو اس صلح سے یہ منظور تھا کہ خونریزی کا انسداد ہو اور قتل کا سلسلہ موقوف ہو جب کہ میں نے دیکھا کہ اب جنگ کا جوش و ولولہ باقی نہیں رہا ہے اور جنگ میں کمزوری ہونے لگی ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ آئندہ بھی جاری رکھی گئی۔ تب بھی نتیجہ میں ایک دن معاویہ کی بادشاہت قائم ضرور ہو جائیگی"۔

یہ حضرت نے اپنے مخاطب کی مذاق طبیعت کے موافق کلام فرمایا۔

اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اُٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور حضرت سے پوری گفتگو امام حسنؑ کی بیان کی حضرت نے فرمایا۔ صدق ابو محمد فلیکن کل رجل منکم حلسا من احلاس بیتہ مادام ھذا الانسان حیا" سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے۔ تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے اسطرح گھر میں بیٹھ جائے جس طرح وہ فرش جو سب سے نیچے بچھایا جاتا ہے جیسے چٹائی جو بدلی نہیں جاتی اور اُٹھتی نہیں ہے اُس وقت تک کہ جب تک یہ شخص یعنی امیر شام معاویہ زندہ رہے۔"

یہ ہیں وہ واقعات جن سے حقیقت حال بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اُن لوگوں کا خیال غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ صلح سے راضی نہ تھے۔ آپ کا طرز عمل بھی یہی بتلاتا ہے کہ صلح پر آپ نے قیام کیا۔ جنگ کی کوئی تیاری نہیں کی۔

دس برس آپ کو امام حسنؑ کی معیت میں گذرے۔ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھائی کے دباؤ سے آپ صلح پر قائم رہے لیکن امام حسنؑ کے بعد بھی، ۱۰ برس تک آپ خاموش نظر آتے ہیں۔ جبکہ شیعی عقائد کے مطابق امامت آپ کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

امام حسنؑ کی زندگی خاموشی سے گذری۔ کسی قسم کا تعرض نہیں ہوا۔ کوئی جنگ کی صورت نہیں۔ لیکن معاہدہ جو ہوا تھا وہ کہاں تک پایۂ تکمیل

کو پہونچا ؟ اس پر کس حد تک عمل ہوا ؟ اسکو تاریخ کا دیکھنے والا بچہ بچہ خوب جانتا ہے۔

میں اگر تاریخی واقعات کو تفصیل سے پیش کرنا چاہوں تو وقت و فرصت میں گنجائش نہیں ہے۔ لہذا مختصر طور سے یہ دکھانا ضروری سمجھتا ہوں، کہ شرائط صلح جو قرار پائے تھے اُن پر عمل نہیں ہوا۔

یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں کوئی کہے اور کوئی انکار کرے۔ بلکہ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جو انکار کے قابل نہیں ہیں۔

پہلی شرط معاہدہ کی یہ ہے کہ ان یعمل فیھا بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہؐ وسیرۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عمل ہونا چاہیے کتاب خدا پر اور رسالتمآبؐ کی سنت پر اور ایسے خلفاء کی سیرت پر جو راشدین و مہدیین سمجھے جا سکیں۔"

اس پر کہاں تک عمل ہوا اور کہاں تک نہیں ہوا۔ اس کا بیان بہت طویل الذیل ہے۔ میں مختصر طور سے یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ یہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ خود شیعوں کا جو عقیدہ ہے وہ تو ہے ہی۔ میں نے اس وقت عقائد شیعہ کی تبلیغ کا ارادہ نہیں کیا ہے، اُس کے دوسرے مواقع ہیں، لیکن عام اسلامی نقطۂ نظر اور اکثریت مسلمین یعنی سوادِ اعظم کے زاویۂ نگاہ سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد

صرف تیس برس تک خلافت راشدہ کا دور رہا ہے۔ ایک حدیث بھی اس کے متعلق بیان کیجاتی ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا۔ ان الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ "خلافت میرے بعد تیس برس تک ہے۔"

یہ تیس برس کی مدت پوری ہو جاتی ہے اُس چھ مہینہ تک جس میں امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ سے خلافت کا تعلق رہا ہے اور بس اسکے بعد سے یعنی جب سے کہ آپ نے معاویہ کے ساتھ صلح کر کے خلافت اُن کے سپرد کی وہ تیس برس کی مدت ختم اور خلافت کا زمانہ منقضی ہو گیا۔ بس اس کے بعد ملوکیت ہے، جہانبانی ہے، دنیاداری ہے، مگر خلافت نہیں ہے۔

غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا سنت رسولؐ اور راشدین و مہدیین خلفاء کی سیرت پر عمل ہو تو امیر معاویہ کی حکومت، خلافت راشدہ کے حدود سے خارج کیوں قرار پاتی۔

عمر بن عبد العزیز تک کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ اُن کا زمانہ ملحقات خلافت راشدہ سے ہے، مگر فاصلہ ہو جانے کی وجہ سے اُس میں محسوب نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی سیرت اپنے ہمنام حضرت خلیفہ ثانی کی سیرت سے ملتی جلتی ہے۔ لہذا اُن کی حکومت راشدہ خلافت کے نام کی مستحق ہے۔ مگر امیر معاویہ کے دور حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے

ظاہر نہیں کی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا تھا

بس پھر اب میں واقعات کا جائزہ لیکر کیا کروں جب کہ ایک صحیح

متفقہ علمی فیصلہ میرے سامنے آگیا جسپر تمام مسلمانوں کی مہر تصدیق ثبت ہے

دوسری شرط یہ تھی کہ تمام لوگ امن و امان میں رہیں گے اور صبر و

سکون کی فضا میں سانس لے سکیں گے"۔ اس کے متعلق تاریخی کتب

کے صفحات انتہائی تاریک مرقع پیش کر رہے ہیں۔

زیاد بن سمیہ کی حکومت عراق میں اور اُس کے بعد سے جو واقعات

پیش آئے ہیں وہ ایک مختصر وقت میں تذکرہ کے قابل نہیں ہیں۔

حجر بن عدی اور اُن کے کچھ ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دئے گئے۔

حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے معاہدہ پر قائم ہیں

اور بغاوت نہیں کر رہے ہیں، مگر وہ باوجود اسکے اُس عظیم جرم کی بنا پر قتل

کر دئے گئے جس کا نام ہے محبت اہلبیتؑ۔ اُن کے متعلق نہ حلم میں کوئی گنجائش

تھی نہ رحم و کرم اُن پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔

یہ واقعہ ایسا تھا جس پر تمام عالم اسلام نے اظہار تاثر کیا اور غم و غصہ

کا اظہار کیا۔

یہ حجر بن عدی کون تھے؟ استیعاب میں ہے: کان من فضلاء

الصحابہ، یہ صحابہ کرام کے اندر افاضل میں محسوب ہیں ـــــــ کتب

فیہ زیاد الی معاویۃ فامرہ ان یبعث بہ الیہ فبعث الیہ مع وائل

بن حجر الحضرمی فی اثنی عشر رجلا کلھم فی الحدید فقتل معاویۃ

منھم ستۃ واستحیی ستۃ وکان حجر ممن قتل" ان کے بارے

میں زیاد نے امیر شام کو شکایت کا خط لکھا۔ حکم دیا گیا کہ ان کو شام کیطرف

بھیجدو یہ بارہ آدمی تھے جو لوہے میں جکڑ کر شام کی طرف بھیجدیئے گئے۔

معاویہ نے چھ آدمیوں کو قتل کیا اور چھ آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ اور حجر

بن عدی بھی اُن میں سے تھے کہ جو قتل کیے گئے"

اب ان کی ہر دلعزیزی ملاحظہ ہو فبلغ ما صنع بھم زیاد الی

عائشۃ فبعثت الی معاویۃ عبد الرحمن بن الحارث بن ھشام

" زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنین عائشہ کو پہونچی۔ آپ نے عبد الرحمن

بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ امیر شام کے پاس

روانہ کیا۔ اللہ اللہ فی حجر واصحابہ " خدا سے خوف کرنا حجر اور انکے

ساتھیوں کے بارے میں" مگر افسوس ہے کہ عبد الرحمن اُس وقت

پہونچے جب حجر اپنے پانچ ساتھیوں کی معیت میں قتل ہو چکے تھے۔

عبد الرحمن نے معاویہ سے کہا۔ عزب عنک حلم ابی سفیان فی

حجر واصحابہ الا حبستھم فی السجون وعرضتھم للطاعون

"آپ کے پاس سے کہاں گیا تھا ابوسفیان سے ملا ہوا حلم؟ آپ نے اُس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے اُن کو جیلخانے ہی میں قید کر دیا ہوتا اور وبا و طاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔"

امیر شام نے (شاید طنز کے طور پر) جواب دیا حین غاب عنی مثلاث من قومی۔ "تمہارا جیسا کوئی مشورہ دینے والا نہ تھا اس لیے ایسا ہوا۔" عبدالرحمٰن نے کہا۔ واللہ لاتعد لک العرب حلما بعدھا ابدا ولا رأیا قتلت قوما بعث بھم الیک اساری من المسلمین

"اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا، اور نہ آپ کی اصابت رائے قابل تسلیم رہی ہے۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جنکو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے۔"

جب معاویہ مدینۂ رسول میں آئے اور حضرت عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ام المومنین نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا، اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے اپنی جرأت و دیدہ دلیری سے کہا۔ فدعینی وحجر احتی نلتقی عند ربنا

"اچھا پھر چھوڑ دیجیے مجھے اور حجر کو، خدا کے یہاں دیکھا جائیگا۔"

یہ تھی اہمیت اس قتل کی ام المومنین کی نظر میں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ آپ بازار میں تشریف رکھتے تھے۔ فنعی الیہ حجر

فاطلق حبوته وقام وقد غلب علیه النحیب۔ آپ کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو آپ بیچین ہو گئے۔ نشست کو قائم نہ رکھ سکے، اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کے رونے لگے۔

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ جب حجر بن عدی کو سزائے موت سنائی گئی۔ قال دعونی اصلی رکعتین۔ انھوں نے کہا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔" اجازت ملی، انھوں نے دو رکعت نماز اختصار کے ساتھ ادا کی۔ اسکے بعد کہا۔ لولا ان تظنوا بی غیر الذی بی لاطلتهما۔" اگر تم کو یہ خیال نہ پیدا ہوتا کہ میں قتل کے خوف سے نماز میں طول دے رہا ہوں تو میں نماز اتنے جلد ختم نہ کرتا۔"

محمد بن سیرین سے سوال کیا جاتا تھا کہ مقتول کو اپنی موت سے پہلے نماز پڑھنا چاہیے یا نہیں، تو وہ جواب دیتے تھے، کہ صلاھا خبیب و حجر وھما فاضلان۔" خبیب اور حجر دونوں آدمیوں نے اپنے قتل کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، اور یہ دونوں فاضل شخص تھے۔"

(اسکے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کا فعل ہمارے لیے سند ہے)۔

حضرت حسن بصری کے متعلق مذکور ہے کہ اُن سے معاویہ اور قتل حجر کا تذکرہ ہوا تو اُنھوں نے کہا۔ ویل لمن قتل حجرا واصحابہ۔" وائے ہو اُس پر جس نے حجر اور اُن کے اصحاب کو قتل کیا۔"

امام احمد بن حنبل نے اپنے اُستاد یحییٰ ابن سلیمان سے دریافت کیا کہ کیا حجر بن عدی مستجاب الدعوہ تھے؟ تو انھوں نے کہا۔ نعم وکان من افاضل اصحاب النبی۔ "ہاں اور افاضل اصحاب رسول میں سے تھے"۔

ام المومنین عائشہ نے جو پیغام بھیجا تھا، اور پھر جو زبانی گفتگو امیر شام سے فرمائی اُس کا تذکرہ ہو چکا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے مقام پر حجر کے قتل کے متعلق کس طرح اظہار خیال کیا۔ آپ نے فرمایا۔

اما واللہ لو علم معاویۃ ان عند اھل الکوفۃ منعۃ ما اجترأ علی ان یأخذ حجرا واصحابہ من بینھم حتیٰ یقتلھم بالشام ولکن ابن آکلۃ الاکباد علم انہ قد ذھب الناس اما واللہ ان کانوا لجمجمۃ العرب منعۃ وفقھا وللہ در لبید حیث یقول۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم ۔۔۔ وبقیت فی خلف کجلد الاجرب
لا ینفعون ولا یرجیٰ خیرھم ۔۔۔ ویعاب قائلھم وان لم یشغب

"اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت وہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرنے کی جرأت نہ کرتا کہ شام میں بلوا کر انھیں قتل کرے لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم تھا کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں، خدا کی قسم یہ لوگ اپنی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جا سکتے تھے لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا

سے اپنے اشعار میں جنکا مضمون یہ ہے۔

"گذر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کیجا سکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں اب ایسے پسماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو ان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے، جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو جا ہے وہ شور و غل برپا نہ کریں۔"

یہ تھے تاثرات مختلف اکابر اسلام کے حجر بن عدی کے واقعہ قتل کے اوپر۔ ایک بزرگ تھے ربیع بن زیادہ حارثی جو ابن زیاد کی طرف سے خراسان کے حاکم تھے۔ انھیں جب حجر بن عدی کے قتل ہونے کی خبر پہونچی تو انھوں نے کہا اللھم ان کان للربیع عندک خیر فاقبضہ الیک وعجل۔" خداوندا! اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اُس کی روح کو قبض فرمالے۔ فلم یبرح من مجلسہ حتی مات۔" ابھی اپنی جگہ سے ہٹے نہ تھے کہ روح قبض ہو گئی اور دنیا سے مفارقت کی۔ (۱)

جب امیر شام کا مرض الموت شدید ہوا تو عبداللہ بن یزید اسدی

(۱) مذکورہ بالا واقعات کے لیے ملاحظہ ہو، استیعاب مطبوعہ مصر برحاشیہ اصابہ ج ۱ ص ۳۵۶ - ۳۵۹ -

آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ آپ بہت مضطرب ہیں۔ اُس نے (خوشامد کے طور پر) کہا کہ آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت ؟ اگر مر گئے تو جنت میں پہونچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا "خدا تمھارے باپ پر رحمت نازل کرے وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کر رہے تھے"۔ (۱)

یہ آخری وقت تھا کہ جب اپنے طرزِ عمل کا احساس ہو رہا تھا۔ طبری میں لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات پہونچا تو اُنھوں نے تین مرتبہ کہا۔ یوم لی من ابن الادبر طویل ۔ حجر بن عدی کے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہے (۲) (حزن و مشقت کی دنیا طولانی ہوتی ہے جس طرح راحت و مسرت کی مختصر۔ لہذا مقصود یہ ہے کہ مجھے بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا ہے اس قتل کے سبب سے)۔

یہ تو حجر کا قتل تھا لیکن دوسرے نہ معلوم کتنے بے گناہ تھے جو سیاست کی تیغ بیدریغ کے نذر ہو چکے تھے۔

یہ شرط تھی معاہدہ کی جسکی تعمیل اسطرح کیگئی۔

اس کے بعد وہ شرط تھی کہ کسی کو اپنا جانشین نہ بنائیں گے۔ یہ شرط کچھ زیادہ بیان کی محتاج نہیں ہے معلوم ہے جو کچھ ہوا۔ جانشین بنایا گیا

(۱) اصابہ۔ ج ۳ ص ۶۵۱ - (۲) طبری۔ ج ۶ ص ۱۵۶

اور کون؟ یزید ایسا فاسق و فاجر ننگ مسلمین و اسلام، اور اسکی جانشینی کو مسلم بنانے کیلیے کیا کیا تدابیر اختیار کیے گئے۔ کس طرح لوگوں سے بیعت حاصل کی گئی۔ وہ جلسے دیکھنے کے قابل تھے جو یزید کی جانشینی کے اعلان کے لیے منعقد کیے گئے تھے۔ کس طرح اُن میں جبر و تشدد کا مظاہرہ تھا۔ کس طرح عام افراد کے ضمیر کو سنہرے اور روپہلے سکوں سے خریدا جا رہا تھا۔

اور یہی اسباب و ذرائع تھے جن سے یزید کی خلافت کو تسلیم کرایا گیا۔
اس کے بعد یہ شرط بھی کہ ظاہر بظاہر یا مخفی طور سے کسی طرح امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے قتل کی تدبیر نہ کیجائے۔
اس شرط کی خلاف ورزی کا اظہار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ خفیہ ریشہ دوانیوں کیلیے ثبوت بہم پہونچانا انسان کا کام نہیں ہے۔
بہر حال یہ تو تقریباً تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امام حسنؑ زہر سے شہید کیے گئے۔ آپ کے قتل ہو جانے کی خبر پر شام کے قصر میں تکبیر کی صدا بھی بلند ہوئی اور اظہار مسرت بھی کیا گیا۔

اس سے زیادہ کہنا میری ذمہ داری کے خلاف ہے۔ خفیہ باتیں کھلجائیں، تو وہ خفیہ کب رہیں۔ قرائن کی دنیا میں بے شک وسعت ہے لیکن اس کے لیے طول کلام کی ضرورت ہے۔

بہر حال شرائط معاہدہ پامال تھے اور کسی ایک شرط پر بھی عمل نہ ہوا تھا۔

(۴)

حضرت امام حسینؓ کی جنگ

اور

رواداری و صلح پسندی کے حیرت انگیز مظاہرات

مذکورہ سابق صورت حال کے بعد جب کہ شرائط صلح بالکل پامال ہو چکے تھے آپ اگر جنگ پر تیار ہو جاتے تو کسی کو الزام دینے کا حق نہ تھا مگر کیا کہنا فرزند رسولؐ کی رواداری کا، کہ وہ اس کے بعد بھی جنگ پر آمادہ نہ ہوئے۔ اُن کا نصب العین یہی رہا کہ میں حمایت باطل سے علیحدہ رہوں لیکن امن سوزی و خونریزی کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہو۔

آپ نے مذکورۂ بالا اخلاف ورزیوں کے بعد وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ہر شائستہ اور پر امن جماعت کے اندر اس قسم کی غیر آئینی باتوں پر اختیار کیا جاتا ہے۔

یعنی آپ نے ایک مکتوب کے ذریعہ سے جو امیر شام کو تحریر فرمایا تھا مذکورۂ بالا باتوں پر احتجاج ضرور فرمایا۔ مکتوب طولانی ہے جس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔

الست القاتل حجراً اخا کندۃ والمصلین العابدین الذین کانوا ینکرون الظلم ویستعظمون البدع ولا یخافون فی اللہ لومۃ لائم ثم قتلتھم ظلما وعدوانا من بعد ما کنت اعطیتھم الایمان المغلظۃ والمواثیق المؤکدۃ لا تأخذھم بحدث کان بینک وبینھم ولا باحنۃ تجدھا فی نفسک

"کیا تم نے نہیں قتل کیا ہے حجر کو جو قبیلۂ کندہ سے تھے اور اُن نماز گذار عابدوں کو جو ظلم کو بُرا سمجھتے اور بدعتوں کو بڑی گراں چیز خیال کرتے، اور خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کے بُرا بھلا کہنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے پھر طرہ یہ کہ تم نے اُن کو ظلم وعداوت سے اُس وقت قتل کیا جب کہ تم اُن کو بڑی بڑی قسموں اور مضبوط وعدوں کے ساتھ اس بات کا اطمینان دلا چکے تھے کہ تم اُن سے کسی اُس خصومت کا بدلا نہ لوگے جو تمھارے اُن کے درمیان میں رہی ہو اور نہ کوئی عداوت نکالوگے جو تمھارے دل میں پائی جاتی ہو۔

اولست قاتل عمرو بن الحمق الخزاعی صاحب رسول اللہ العبد الصالح الذی ابلتہ العبادۃ فنحل جسمہ واصفر لونہ بعد ما امنتہ واعطیتہ من عھود اللہ ومواثیقہ ما لو اعطیتھا طائراً لنزل الیک من راس الجبل ثم قتلتہ جرأۃ علی ربک واستخفافاً

بذلك العهد۔

"کیا تم نے عمرو بن حمق خزاعی کو نہیں قتل کیا جو رسالتمآب کے صحابی اور ایسے نیک بندہ تھے جن کو عبادت نے پژمردہ کر دیا تھا اور اس سے اُن کا جسم لاغر اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ جب کہ تم نے اُن کو امان دی تھی اور عہد کیا تھا ایسی قسموں کے ساتھ کہ اگر کسی پرند طائر سے اسی طرح قسمیں کھائی جائیں تو وہ اطمینان کر لے اور پہاڑ پر سے اُتر کے تمھارے پاس آجائے۔ مگر اس کے بعد تم نے انھیں قتل کر دیا اور اسطرح نہ خدا کا خوف کیا، نہ اُس عہد کا احترام۔"

الست المدّعی زیاد بن سمیة المولود علیٰ فراش عبید ثقیف فزعمت انّہ ابن ابیك وقد قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم الولد للفراش وللعاھر الحجر فترکت سنة رسول اللہ تعمّداً وتبعت ھواك بغیر ھدی من اللہ ثم سلّطتہ علی العراقین یقطع ایدی المسلمین وارجلھم ویسمل اعینھم ویصلبھم علےٰ جذوع النخل۔

"کیا زیاد بن سمیہ جو قبیلہ بنی ثقیف کے ایک ذلیل و حقیر غلام کے بچھونے پر پیدا ہوا تھا اُس کو تم نے اپنے ساتھ ملحق نہیں کیا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ تمھارے باپ کی اولاد ہے حالانکہ رسالتمآب کی

حدیث ہے کہ اولاد اُسی سے ملحق ہے جس کا بچھونا ہو اور زنا کار کے لیے خاک پتھر ہے اور بس۔ مگر تم نے جان بوجھ کر سنت رسولؐ سے مخالفت کی اور بغیر کسی دلیل کے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی پھر اُس کو تم نے عراق عرب وعجم پر مسلط کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں قطع کرتا اور اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا تا اور اُنکو درختوں پر سولیاں دلواتا ہے"۔

اولست صاحب الحضرمیین الذین کتب فیھم ابن سمیة کانوا علی دین علیؑ فکتبت الیه ان اقتل کل من کان علی دین علیؑ فقتلھم ومثل بھم بامرک۔

"کیا تم اُس حضرمی جماعت کے خون کے ذمہ دار نہیں ہو جن کے بارے میں زیاد نے لکھدیا تھا کہ یہ علی کے دین پر ہیں تم نے لکھا کہ جو شخص علیؑ کے دین پر ہو اُسے قتل کر ڈالو۔ اُس نے انھیں قتل کرا دیا، اور اُن کے اعضاء و جوارح کو قطع کیا تمھارے حکم سے"۔

ولعمری ما وفیت بشرطہ ولقد نقضت عھدک بقتلک ھولاء النفر قتلتھم بعد الصلح والایمان والعھود والمواثیق فقتلتھم من غیر ان یکونوا قاتلوا وقتلوا ولم تفعل ذلک لھم الا الذکرھم فضلنا وتعظیمھم حقنا۔

"حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک شرط کو بھی پورا نہیں کیا۔ تم نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا ان لوگوں کے قتل کے ساتھ جنھیں تم نے صلح ہو چکنے اور عہد و پیمان ہو جانے کے بعد قتل کیا، تم نے انھیں قتل کیا بغیر اس کے کہ انھوں نے جنگ کی ہوتی اور کسی کو قتل کیا ہوتا، اور تم نے جو کچھ کیا وہ صرف اس بنا پر کہ وہ ہمارے فضائل کو ذکر کرتے اور ہمارے حقوق کی معرفت رکھتے تھے۔"

کیا دنیا میں اس قسم کی کارروائیوں کے خلاف اس سے زیادہ کوئی پرامن طریقہ ہے۔

امام حسینؑ نے رواداری سے کام لیا اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی دس برس تک امام حسنؑ کی وفات کے بعد خاموشی کی زندگی بسر کی۔ حالانکہ اس مدت میں کیسے صبر آزما مراحل پیش آئے۔

امام حسنؑ کی وفات اور رسولؐ کے روضہ میں دفن سے ممانعت، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے حسینؑ جن کی شجاعت جنگی قوت و طاقت، جن کی ہمت و جرأت کا واقعہ کربلا نے دنیا سے کلمہ پڑھوا دیا ہے، وہ اس موقع پر خاموش ہو رہتے ہیں۔ روضۂ رسولؐ سے پلٹا لیتے ہیں اور بقیع میں دفن کر دیتے ہیں۔

یہ رواداری نہ تھی تو کیا تھی؟

یزید کی بالکل غیر آئینی خلافت کے سلسلہ میں امیر معاویہ نے جو صورتیں اختیار کیں، جلسے کیے، ممالک اسلامیہ میں پیغام روانہ کیے، لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا، مگر امام حسینؓ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

مثلاً یہ کہ اسلامی بلاد میں خطوط بھیجتے، احتجاجی جلسے کرتے۔ یہ ثابت کرتے کہ یزید کی ولیعہدی غلط ہے وہ آئین کے خلاف ہے۔ حق ہمارا ہے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے۔ یہ نہیں ہوا، اور کوئی تاریخ دنیا کی اس قسم کی کوئی مثال پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔

حد یہ ہے کہ خود مدینہ منورہ میں محفلیں منعقد ہوئیں۔ مکہ معظمہ میں جب امام حسینؓ موجود تھے جلسہ کیا گیا، اور لوگوں سے بیعت لی۔ کیا آپ اگر مخالفت کرتے تو اُس کا کچھ اثر پیدا نہ ہوتا؟ لیکن آپ خاموش رہے۔ ہاں بیشک خود بیعت نہیں کی جس کے معنی یہ تھے کہ ہم امن و امان کے طالب ہیں۔ خاموشی پسند کرتے ہیں مگر حمایت باطل سے علیحدہ رہتے ہیں۔

ہم گوشہ نشین ہیں ہمیں دنیا سے مطلب نہیں ہے تمھیں جو کرنا ہو کرو۔ جسے چاہو ولیعہد، خلیفہ، بادشاہ جو کچھ بناؤ لیکن ہم سے مطلب نہ رکھو۔ ہم سے بیعت کے خواہاں نہ ہو۔ دنیا سے بیعت لے لو لیکن ہم سے نہ لو۔

یہ اصول تھا جس پر امام حسینؑ اوّل سے قائم تھے اور آخر تک قائم رہے

جب امیر معاویہ مدینہ منورہ آئے ہیں تو اُس موقع پر اُنھوں نے امام حسینؑ کے سامنے بھی بیعت کی تحریک پیش کی، مگر آپ نے مناسب طریقہ سے اُس مطالبہ کو ٹالدیا اور بیعت نہیں کی[۱]

امیر معاویہ نے اپنی آزمودہ کاری اور جہاندیدگی کی بنا پر آپ کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور نہ آپ کو مجبور کرنے کی ضرورت سمجھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسینؑ امن وامان کے حامی ہیں۔ جبتک ہم خود انھیں مجبور نہ کرینگے وہ امن پسندی سے علٰحدہ نہونگے۔

لیکن اسکے بعد امیر شام کا انتقال ہوگیا اور یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ باپ بیٹے میں زمین آسمان کا تفرقہ تھا۔

وہ صحابۂ رسولؐ کے زمرہ میں محسوب۔ آپ کی بہن رسول اللہ کے عقد میں تھیں، اور اس لیے آپ "خال المومنین" سے موسوم۔ بڑے بڑے اصحاب کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور سرد وگرم زمانہ کو برداشت کیے ہوئے سن رسیدہ۔ تجربہ کار۔ اس لیے ہر موقع ومقام پر سمجھ بوجھکر قدم اُٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے تھے لیکن یزید۔ عمر کا اقتضار۔ جوانی کی اُمنگ۔ زندگی کے خاص مشاغل۔ اصحاب رسولؐ کو چھوڑ کر

(۱) تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو "قاتلان حسین کا مذہب"

دوسری قسم کے لوگوں کی صحبت۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اسلامی احکام کی پابندی جس کی ظاہری طور پر ضرورت محسوس کیجاتی تھی، اب بالکل ہی ملحوظ رکھنا ضروری نہ معلوم ہوتی تھی، اور کسی طرح کی آئین پروری لازمی نہ تھی۔

امام حسینؑ اور اُن تین دیگر اشخاص کے متعلق جنھوں نے بعیت نہیں کی تھی خود امیر معاویہ نے بھی انتقال سے پہلے یزید کو متنبہ کردینا ضروری سمجھا تھا اور کہا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے تمھارے متعلق خطرہ ہے۔(۱)

یزید نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی انہی لوگوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری سمجھی، اور ولید بن عقبہ کے نام خط لکھا۔ اسی خط سے افتاد طبع کا اندازہ ہوجاتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ کس درجہ تشدد اختیار کیا جارہا ہے۔ معاویہ کے انتقال کا خط اور اسکے ساتھ ایک علیحدہ پرزے پر یہ کہ حسینؑ اور اُن لوگوں کو جنھوں نے بعیت نہیں کی ہے فوراً بعیت پر مجبور کرو، سختی سے کام لو، کسی قسم کی مراعات نہ ہونے پائے اور نہ مہلت دیجائے۔(۲)

یہ خط ولید کے پاس پہونچا اور ولید نے مروان سے مشورہ کیا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو ہمارا رسالہ "مجاہدہ کربلا" صلا (۲) ان واقعات کو ہم نے تفصیل سے "مجاہدہ کربلا" میں لکھا ہے۔ اس لیے اس موقع پر صرف واقعات کے حوالہ اور اُنکے نتائج پر اکتفا کرینگے۔

مروان کی وہ ہستی ہے جو تمام تاریخوں کے متفقہ فیصلہ سے حضرت خلیفۂ ثالث کے قتل کی ذمہ دار قرار پائی ہے۔ جنگ جمل میں حضرت طلحہ پر تیر لگانا بھی انہی کا کام تھا، اور امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ کو قبر رسولؐ کے پہلو میں دفن سے روکنے والی بھی یہی ذات تھی۔ ایسے شخص سے مشورہ کیا جا رہا ہے تو معلوم ہے کہ کیسا مشورہ ملیگا۔

مشورہ یہ ملا کہ "ابھی ان لوگوں کو بلا کر بیعت طلب کرو۔ اگر منظور کریں تو خیر، نہیں تو ابھی قتل کرا دو"۔

آدمی گیا اور امام حسینؑ و عبداللہ بن زبیر کو طلبی کا پیغام پہونچا دیا۔

امام حسینؑ ولید کے پاس تشریف لائے، مروان بیٹھا ہوا تھا۔

امامؑ کے ساتھ آپ کے اعزا و انصار کی ایک کافی جماعت مسلح و مکمل موجود تھی جس کو آپ نے دروازہ پر ٹھہرا دیا تھا اور کہہ دیا تھا، کہ جب میں تمھیں بلاؤں یا ولید کی آواز بلند ہو تو تم اندر داخل ہو جانا۔

ولید نے معاویہ کے انتقال کی خبر اور بیعت کا پیغام دیا جسے سُنکر حضرت نہ برافروختہ ہوئے نہ غصہ کا مظاہرہ کیا، بلکہ یہی چاہا کہ معاملہ کسی طرح ٹلجائے، اور فرمایا۔

"اچھا! تو مجھ ایسے شخص سے تم بیعت لوگے تو اس پر تو راضی نہ ہوگے کہ میں مخفی طور سے بیعت کرلوں اور چلا جاؤں، جب تک کہ اُسکا

عام طور سے علانیہ اظہار نہو۔" ولید نے کہا "بیشک"۔

آپ نے فرمایا کہ جس وقت تم معاویہ کی وفات کا اظہار کرنا اور عام لوگوں سے بیعت لینا تو مجھ سے بھی کہنا۔"

ولید نے منظور کیا۔ مروان نے دیکھا کہ میرا مقصد پامال ہو گیا۔ بگڑ کے بولا "اگر اس وقت حسین ہاتھ سے نکل گئے تو پھر بغیر شدید خونریزی کے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ابھی انھیں جانے نہ دو جب تک بیعت نہ کرلیں یا قتل کیے جائیں۔"

امام حسینؑ کو غیظ آگیا اور فرمایا "کیا مجال تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرسکے"۔ یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لے آئے۔

یہ معلوم ہے کہ جب ایک بادشاہ دنیا سے جاتا ہے تو لوگوں میں خاص طور سے اضطراب ہو جاتا ہے، اور نظام حکومت بھی انتہائی کمزور۔ اگر آپ چاہتے تو چونکہ اس وقت مدینہ میں ولید کے پاس کوئی فوج نہ تھی نہ لشکر، ولید کو قتل کردیتے اور مروان کا کام تمام کردیتے تو آپ دیکھتے وقتی حیثیت سے مدینہ میں امام حسینؑ کی سلطنت ہوتی۔ اور آپ کو موقع ہوتا کہ پھر اطراف وجوانب میں خطوط لکھکر دوسرے لوگوں کو اپنے سے متفق کریں۔ مگر یہ تو آپ کو منظور ہی نہ تھا۔ آپ تو بس یہ چاہتے تھے کہ بیعت نہ کریں۔ حمایت باطل سے علیحدہ رہیں۔

اور بس، اس لیے آپ نے مدینہ چھوڑنا گوارا کیا اور کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔

امامؑ نے مدینہ سے ہجرت کی۔ کہاں تشریف لے گئے؟ مکۂ معظمہ۔

مکۂ معظمہ میں آپ کا تشریف لیجانا درحقیقت اس بات کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا کہ آپ کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنی زندگی کو خطرہ سے محفوظ کریں۔ اور باطل کی حمایت سے الگ رہ کر زندہ رہیں، اسلیے کہ ؛ معظمہ لڑائی کی جگہ نہیں، پناہ کی جگہ ہے۔

مکۂ معظمہ وہ جگہ ہے جس کو امن الناس قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا مکہ معظمہ میں جاکر ٹھہرنا یہ اس بات کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا کہ ہم کوئی بغاوت کرنا نہیں چاہتے، اور کسی جماعت کے خلاف کوئی معاندانہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے۔ ہم کو چھوڑ دو، گوشۂ انزواہی میں سہی مگر ہم کو بیعت پر مجبور نہ کرو۔ وہی ایک اصول جو میں عرض کر چکا ہوں۔

جیو اور جینے دو۔"

مکہ معظمہ میں آنے کے بعد دنیا کی کوئی تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دے سکتی کہ آپ نے کچھ خطوط لکھے ہوں، کچھ لوگوں کو مکہ معظمہ کے اندر اپنی طرف دعوت دی ہو یا کچھ لوگوں کو باہر سے بلایا ہو یا لشکر کشی اور فوج کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔ آپ کی زندگی ایک

خاموش زندگی معلوم ہوتی ہے۔

عبداللہ بن زبیر بھی مکہ معظمہ میں تھے اور پہلے لوگ اُن کے گرد آ کر بیٹھا کرتے تھے لیکن جب سے آپ تشریف لائے تمام لوگوں نے عبداللہ کو چھوڑ دیا اور آپکے گرد پروانہ وار مجتمع ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ جناب رسالتمآبؐ سے جو نسبت آپ کو تھی اور مکہ والوں کو جتنی آپ کی ہستی عزیز ہو سکتی تھی، اُتنی عبداللہ بن زبیر کی نہیں تھی عبداللہ کے لیے تو اتنی بڑی جماعت فراہم ہو سکی کہ وہ ایک عرصہ تک حکومت شام سے برسر پیکار رہ سکے تو امام حسینؑ کے لیے یہ ناممکن نہیں تھا مگر آپ نے مکہ معظمہ میں خاموشی کے ساتھ قیام کیا۔ نہ کوئی عملی قدم اُٹھایا اور نہ کسی شورش کی تدبیریں کیں جس شخص نے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا ہو وہ کیا یہ ثبوت نہیں پیش کر رہا ہے کہ وہ کسی سے جنگ کرنا نہیں چاہتا؟ یقیناً آپ اپنی خاموشی کے ساتھ اعلان کر رہے تھے کہ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں۔ چاہتے ہیں کہ دنیا میں صبر و سکون رہے، مگر ہم بھی اپنے اُس حق کے ساتھ جس پر اب تک قائم ہیں قائم رہیں۔ امن و امان بھی ہو اور باطل کی حمایت بھی نہ ہونے پائے۔

عراق والوں کو خبر معلوم ہوئی کہ امام حسینؑ نے اس طرح سے بیعت سے انکار کیا ہے۔ سلیمان بن صرد کے گھر پر اجتماع ہوا اور امام

کے نام عرضداشت تحریر کی گئی کہ آپ یہاں تشریف لائیے۔ ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔

اس کے بعد اور خطوط روانہ ہوئے۔ کوفہ کی فضا ہوتی حیثیت سے درست تھی۔ کچھ لوگوں نے دھوکا کھایا۔ کچھ نے دھوکا دیا۔ غرض ۵۳ عرضداشتیں دو دن کے اندر حضرت کی خدمت میں روانہ ہو گئیں۔ اور اس کے بعد بھی خطوط کا سلسلہ قائم رہا۔

ان تحریروں کی نوعیت کیا تھی؟ ان کا حقیقی مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ ان سب لوگوں کو واقعی ہمدردی ہی تھی یا کچھ لوگوں کے دل میں اغراض فاسدہ کام کر رہے تھے؟ یہ سب چیزیں میرے موضوع سے خارج ہیں۔ ان کو میں نے اپنے رسالہ "قاتلان حسینؑ کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے۔

میرا موضوع تو اس وقت یہ ہے کہ امام حسینؑ کے طرز عمل میں رواداارانہ پہلو کس حد تک پایا جاتا ہے، اور آپ نے کس کس طرح صلح پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

مجموعی خطوط کی تعداد سیکڑوں تک پہونچی، اور خورجینیں مملو ہو گئیں۔ ان خطوط میں کیا تھا؟ یہ تھا کہ "ہمارا کوئی امام نہیں ہے نعمان بن بشیر کے ساتھ ہم نماز نہیں پڑھتے جمعہ و جماعت میں شریک

نہیں ہوتے۔ آپ اگر تشریف لے آیئے تو شاید ہم حق پر مجتمع ہو جائیں ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو نعمان بن بشیر کو نکال باہر کریں اور اُسے شام جانے پر مجبور کر دیں"

امام حسینؑ نے ان خطوط کو ملاحظہ فرما کر مصلحت وقت کی بنا پر مناسب سمجھا کہ اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کریں کہ وہ حالات کا مطالعہ کر کے اطلاع دیں اور پھر اُس کے مطابق صورت عمل کا تعین ہو۔

اس موقع پر جو خط آپ نے اہل کوفہ کے نام تحریر فرمایا اُس کا مضمون قابل ملاحظہ ہے:(۱)

"یہ خط ہے حسین بن علیؑ کا جماعت مومنین و مسلمین کی طرف۔ ہانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر میرے پاس آئے (یہ "ہانی" ہانی بن ہانی سبیعی ہیں اور "سعید" سعید بن عبداللہ حنفی، یہ دونوں سب سے آخری خط لے کر آئے تھے جو آپ کی روانگی کا قریبی محرک ہوا۔ اس لیے آپ نے انہی کا حوالہ دیا ہے)

یہ آخری دو شخص تھے جو میرے پاس تمہارے خطوط لیکر آئے میں نے جو کچھ تم نے لکھا تھا اُس کو غور سے پڑھا۔ تمہارے اکثر خطوط کا

(۱) خط کی اصلی عبارت کیلیے ملاحظہ ہو "مجاہدہ کربلا" صـ۲۴۲

مفاد یہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آیئے تو شاید آپ کی بدولت خدا ہم کو حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں بھیجتا ہوں تمھاری طرف اپنے بھائی، چچا کے بیٹے، اور اپنے گھرانے والوں میں سے ایسے شخص کو جس پر مجھ کو اعتبار ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ یہ وہاں جا کر مجھ کو تمھارے حالات اور تمھارے آراء و خیالات سے مطلع کریں۔ اگر انھوں نے مجھ کو تحریر کیا کہ تمھارے خیالات وہی ہیں جو تم نے اپنے خطوط میں تحریر کیے ہیں اور صرف عوام نہیں بلکہ تم میں کے ذمہ دار افراد بھی اُس پر متفق ہیں تو میں انشاء اللہ تمھاری طرف بہت قریبی زمانہ میں روانہ ہو جاؤنگا۔"

اُن کے خطوط میں یہ بھی درج تھا کہ اگر آپ آجائیں تو ہم نعمان کو باہر نکال دیں اور آپ کو حاکم بنا دیں اس لیے حضرت نے آخری الفاظ تحریر فرمائے ہیں جو انتہائی توجہ کے مستحق ہیں۔

ما الامام الا العامل بالکتاب والآخذ بالقسط والدائن بالحق والحابس نفسہ علی ذات اللہ۔

اسکے معنی یہ ہیں کہ امام کے لئیے یہ ضروری نہیں کہ وہ تاج و تخت کا بھی مالک ہو، یا ظاہری ساز و سامان رکھتا ہو قصر حکومت میں مقیم ہو۔ امام وہ ہے جو کتاب خدا کے ساتھ فیصلہ کرے۔ حق پر

قائم رہے اور خدا کی مرضی پر اپنی ذات کو قائم رکھے"۔
گویا حضرت کا مقصد ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں جو آرہا ہوں تو کسی کے خلاف تلوار اُٹھاؤں گا یا تخت سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے آرہا ہوں بلکہ مجھے ہدایت خلق منظور ہے۔ کتاب الٰہی اور سنت رسالت پناہی کا اجراء مقصود ہے۔

دیکھیے خط میں اشارہ تک نہیں ہے کہ ہمارا سفیر جب تمہارے پاس پہنچے تو کوفہ کے حاکم کو باہر نکال دینا۔ ہمارے سفیر اور ہمارے فرستادہ کو حکومت کا نظم سپرد کرا دینا اُس وقت میرے آنے کی اُمید کرنا۔ بالکل نہیں۔ اس میں کسی قسم کی لشکر کشی نہ فوج آرائی کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ صرف احکام کتاب اللہ کی نشر و اشاعت جو ایک حقیقی معلم مذہب اور رہنمائے اُمت کا فرض ہو سکتا ہے۔ اُسی کو نصب العین قرار دیا گیا ہے۔

اگر دنیا بھی روادارانہ مسلک کی سالک ہوتی تو امام کا طرزِ عمل ذرا بھی فتنہ و فساد کا موجب نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کوفہ تشریف لیجاتے۔ وہاں کے حالات کی اصلاح ہوتی، اور پھر کسی کو کوئی نقصان نہ پہونچتا۔ نہ خونریزی کا ذرہ بھر بھی شائبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جماعت جسے ملت اسلامیہ کی مذہبی واقفیت اور شرعی پابندیوں کا احساس

ہی اپنے لیے ایک صدمۂ جانکاہ معلوم ہوتا ہو۔ اُس کے لیے آپ کا اتنا ہی طرزِ عمل ہزار مصائب کا پیش خیمہ معلوم ہو سکتا ہے۔

حضرت مسلمؓ جو آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے معتمد خاص اور قابل اعتبار تھے۔ وہ یقیناً آپ کی تعلیم سے یکسر مُو انحراف نہ کر سکتے تھے اس لیے اُن کے طرزِ عمل کو دیکھنا بھی جو اُنھوں نے کوفہ میں اختیار کیا بہت حد تک امام کے مقصد کو روشن بنا سکتا ہے۔

مادی نقطۂ نظر سے کہ جس کے لیے ظاہری طور پر اہل کوفہ امام حسینؑ کو دعوت دے رہے تھے، حضرت مسلم جب حضرتؑ کی طرف سے نائب خاص بنا کر بھیجے گئے ہیں تو وہ ایک حاکم کی حیثیت رکھتے ہیں جو وقتی طور سے حکومت کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس کا اقتضا وہ تھا کہ حضرت مسلم اپنے لیے ظاہری شان و شوکت۔ تمکنت و اقتدار کا اہتمام کرتے۔ کوفہ میں پہنچنے سے پہلے ایک دو دن کہیں ٹھہرتے۔ اہل کوفہ کو اپنے آنے کی اطلاع دیتے۔ لشکر کی تیاری کا حکم کرتے اور تمام اہل کوفہ کو استقبال کے لیے بلا کر انتہائی ساز و سامان کیساتھ حاکمانہ شان سے کوفہ میں داخل ہوتے، پھر نعمان بن بشیر کا کوفہ کے دارالامارہ سے اخراج کرتے اور خود دارالامارہ پر قبضہ کر کے اُسمیں قیام فرماتے۔

مگر علیؑ کے بھتیجے اور حسینؑ کے سفیر نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ یہ کہ

فقیرانہ لباس میں بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تزک و احتشام کے کوفہ میں داخل ہو گئے۔ نعمان بن بشیر دارالامارہ کے اندر، تخت و تاج کا مالک۔ حضرت مسلم کو نہ اُس سے کوئی مطلب اور نہ تعرض۔ آپ جاتے ہیں اور ایک متوسط الحال انسان مختار بن ابو عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہو جاتے ہیں۔

وہاں اجتماع ہوتا ہے تو امام کا خط پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور بس۔ لوگ امام کی اطاعت اور محبت و اُلفت کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور آپ اُن سے بیعت لیتے ہیں۔ یہ بیعت اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کوئی بغاوت برپا کرنا چاہتے ہیں یا ایک سلطنت کی بنیاد قائم کرتے ہیں بیعت کا مفاد اصلی ایک معاہدہ اور قرار داد سے آگے نہیں ہے ہر چیز کے لیے ایک رسم ہوتی ہے، اور وہ رسم اُس حقیقت کی مظہر۔ جیسے ہمارے یہاں کی عام خلقت میں بھی کسی بات کا عہد و پیمان ہوتا ہے تو کہتے ہیں "لاؤ ہاتھ تو ملاؤ" یہ ایک مظاہرہ ہوتا ہے دست بدست ہونے کا۔

یوں ہی عرب میں جس وقت خرید و فروخت کا مسئلہ بائع و مشتری کے درمیان طے پا تا تھا تو ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے جس کی وجہ سے معاملۂ بیع کے لیے صفقہ کی لفظ کا استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح مختلف

منشم کے معاہدات جو ہوتے تھے تو اُن میں کوئی مظہر عملی شرکائے معاہدہ کے درمیان عمل میں آتا تھا جو کبھی خصوصی حیثیت سے ایجاد کیا جاتا تھا۔ جیسے ایک مخصوص جنگ کے لیے عہد و پیمان اور قسم لیے جانے کے موقع پر منشم عورت کے یہاں کا عطر تھا جس میں سب نے انگلیاں ڈبوئی تھیں اور یہ مظاہرہ تھا اُس معاہدہ کی تکمیل کا اور چونکہ اُس جنگ میں ہزاروں آدمیوں کی خونریزی ہوئی اسلیے یہ مثل عرب کی ہوگئی کہ (اشئام من عطر منشم) یعنی یہ چیز منشم کے عطر سے زیادہ منحوس ہے۔" اسی طرح عمومی طریقہ معاہدہ کا جو تھا وہ بعیت یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا" یہ رمز ہوتا تھا اس بات کا کہ میں، آپ کے ساتھ ہوں اور قرارداد پر قائم رہونگا۔

تو اس بعیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ بعیت تو سلطنت ہی کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ نے جو بعیت لی تو آپ یقیناً یزید کے خلاف حکومت کی بنیاد قائم کر رہے تھے"

ایسا نہیں ہے۔ آج بھی پیر و مرید کے درمیان بعیت کا طریقہ جاری ہے۔ لیکن اس میں نہ کوئی فوج کشی ہوتی ہے۔ نہ سلطنت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

یہ بعیت جو حضرت مسلم نے لی یہ بھی اسی قرارداد کی پہچان تھی کہ

ہم حضرت امام حسینؑ کی پیروی اور حضرت کے اتباع پر آمادہ ہیں اور حضرت کی حفاظت وحمایت میں بجان ودل کوشاں رہیں گے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہمارے مذہبی عقیدہ میں سلطنت اہلبیت کا حق تھی، اور یہ بھی تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ اہلبیت اپنے تئیں خلافت وامامت وامارت مسلمین کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے لہٰذا اگر حقیقۃً امام حسینؑ خلافت کے طالب بھی ہوتے اور یہ بیعت جو اہل کوفہ سے لی گئی وہ تشکیل سلطنت ہی کے لیے ہوتی تب بھی حقانیت صداقت اور مذہبی حیثیت سے کوئی الزام آپ پر عائد نہیں ہوتا۔ ایک شخص اپنا حق سمجھتا ہے اس کو طلب کرتا ہے۔ اور دوسروں کو اسکے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

کوئی الزام مذہبی حیثیت سے امام حسینؑ کے دامن پر نہیں آتا۔ مگر چونکہ دنیا میں آئین پسندی وحق پرستی اور چیز ہے اور جہانبانی وجہانداری اور چیز۔ اس صورت میں دنیا کو یہ کہنے کا حق ضرور پیدا ہوتا کہ یزید مذہبی حیثیت سے حق پر نہ سہی لیکن ہم امیر معاویہ کے زمانہ سے اس سلطنت کو خلافت راشدہ اور امامت حقہ تھوڑی سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر میں وہ سلطنت ہے اور ملوکیت۔ جہانداری وجہانبانی کا تقاضا یہی ہے کہ جو شخص بھی مقابلہ پر آمادہ ہو چاہے وہ

کتنا ہی حقدار کیوں نہ ہو لیکن جب ہمارے مقابل ہو تو سیاست جابرہ کے عمل میں اُسے پامال ہی کر دیا جائے اور اُس کی زندگی کو ختم۔ لہذا یزید نے جو کچھ کیا وہ مذہبی حیثیت سے حق بجانب نہ سہی لیکن جابرانہ سیاست کے رو سے اور ملوکانہ اصول کے تحت میں اُس کو کرنا ہی چاہیے تھا جو اُس نے کیا، بادشاہ وقت کے خلاف کھڑا ہونے والا کتنا ہی حقدار ہو مگر اصول بادشاہت کے تحت میں۔ نظم و نسق کی حفاظت میں وہ قتل ضرور کیا جائیگا۔

لیکن میرے مذکورۂ بالا بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ملوکانہ اصول کے تحت میں دیکھا جائے تب بھی امام حسینؑ کے خلاف یزید کا اقدام حق بجانب نہیں معلوم ہوتا یعنی شاہی اور جہانبانی کے آئین و اصول کے رو سے بھی امام حسینؑ کا کوئی طرز عمل باغیانہ نہ تھا اور شورش انگیزی کی صورت نہیں تھی۔

آپ صرف ہدایت خلق۔ امور مذہبی کی اصلاح اور روحانی تربیت کے لیے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ میں کسیطرح موقع پاؤں اور دنیا کو اخلاق و تہذیب اور تعلیمات اسلامی کے سکھانے کا فرض انجام دے سکوں۔ آپ نے اسی کو ان الفاظ میں تحریر کیا تھا کہ "امام وہ ہے جو کتاب خدا پر عمل کرے اور سنت

رسولؐ پر پابندی کے ساتھ قائم رہے۔ اپنے نفس کو خدا کی مرضی پر منحصر رکھے۔

آپ یہ چاہتے تھے "سلطنت تم کو مبارک حکومت تمکو مبارک مگر فرائض اسلام میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ اسلام کی تعلیم اور دنیا کی اخلاقی تربیت کا ہمکو موقع حاصل رہے۔ بس یہ صورت امام حسینؑ کے طرز عمل میں نمایاں رہے۔

اگر مادی حیثیت سے آپ یزید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا چاہتے تو کیا اس کی تیاریاں ایسی ہی ہوتیں جیسی آپ نے کیں؟ بے شک حسینؑ یزید کی سلطنت کے تختہ کو الٹنا چاہتے تھے مگر سلطنت حاصل کر کے نہیں بلکہ اپنی جان دیکے۔

یقیناً اگر اس حیثیت سے امام کامیابی حاصل کرنا چاہتے تو وہ کامیابی محدود حیثیت رکھتی۔ اس صورت میں کہ جب کو فہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی بادشاہت تسلیم کر لیتے تو بھی کیا ہوتا؟ وہی جو امیر المومنینؑ کو ضروریات وقت سے مجبور ہو کر گوارا کرنا پڑا تھا یعنی عراق کی حکومت امام حسینؑ کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی دونوں طرف کی حکومتوں میں مقابلہ ہوتا رہتا۔ مسلمانوں کی طاقتیں آپسمیں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں۔ مگر امام حسینؑ نے جان دے کر جو

کامیابی حاصل کی وہ نہ باعتبار حدود مملکت محدود تھی اور نہ باعتبار
حدود زمانہ محدود۔ اس طرح کی فتح جو حسینؑ نے اپنے قتل کے ذریعہ
سے حاصل کی وہ ایسی تھی کہ ادھر کوفہ کے اندر اضطراب ہوا۔ اُدھر
حجاز کے اندر تاثر پیدا ہوا۔ اُدھر خود شام میں جہاں یزید کے فدائی
تھے اور وہ بنی امیہ کے نام پر جان دیتے تھے یہ احساس پیدا ہوا کہ
حق کس طرف تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اموی تخت سلطنت اُلٹا اور
اسطرح اُلٹا کہ دنیا میں اُسکا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

یہی وہ فتح ہے جو امام حسینؑ نے قتل ہو کر حاصل کی۔ جو زندگی
میں آپ کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ امام حسینؑ یہ ضرور چاہتے
تھے کہ میں یزید کے تخت سلطنت کو برباد کروں، مگر اس طرح نہیں، کہ
آپ کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی ہو۔ دنیا قتل ہو۔ جنگ کے
شعلے بلند ہوں اور بعد اسکے یزید کی سلطنت کو رخنہ آئے، بلکہ آپ
چاہتے تھے کہ خود اپنے تئیں تیر و نیزہ و شمشیر کے حوالہ کریں اور اسطرح
تخت سلطنت یزید کو تباہ کر دیں۔

یہ تھا امام حسینؑ کا طرز عمل اور یہ تھی آپ کی سیاست جو آخر وقت
تک قائم رہی۔ امام حسینؑ نے جہاں تک موقع ملا جنگ سے کنارہ کشی
کی۔ آپ جانتے تھے کہ نتیجہ قتل ہونا ہے لیکن آپ حفاظت خود اختیاری

کی ایسی صورتیں بھی اختیار کر رہے تھے، کہ خودکشی کا الزام آپ کی طرف عائد ہو۔

آپ شرائط پیش کرتے تھے۔ آپ ایسے مواقع بہم پہونچاتے تھے کہ "حمایت باطل" سے الگ رہتے ہوئے کسی صورت سے آپ کی جان محفوظ رہے، مگر جس وقت یہ جواب ملا کہ یزید کے ساتھ "بیعت" یعنی معاہدہ اطاعت کرو تو یہ حمایت باطل کا سوال تھا۔ اس کیلیے امام حسینؑ کسی صورت سے تیار نہ تھے کہ آپ اپنے اُس مسلک کو جو آپ نے مذہبی نقطہ نظر سے دیانتداری کی بنا پر طے کیا تھا اُسکو ایک لحظہ کے لیے بھی ترک کر دیں۔

آپ کا طرز عمل شروع سے یہی قائم رہا۔ امن پسندی کا عنصر برابر کار فرما رہا۔ حضرت مسلمؑ کی بیعت اٹھارہ ہزار کوفہ کے لوگوں نے کی، مگر اس کے بعد بھی انھوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پھر بھی وہ اُسی مختار کے گھر میں مقیم رہے۔ نعمان بن بشیر کو اُسی طرح تخت حکومت پر رہنے دیا۔ خود نعمان کو اس کا احساس تھا کہ جناب مسلم کا طرز عمل معاندانہ نہیں ہے۔ جب لوگوں نے کہا کہ مسلم بیعت لے رہے ہیں اور اس طرح کے سامان کر رہے ہیں اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ تو نعمان نے جواب دیا لا اقاتل

الا من قاتلنی ولا اثب الا علی من وثب علی ولا اخذ بالقرفۃ والظنۃ فمن ابدی صفحتہ ونکث بیعتہ ضربتہ بسیفی ما ثبت قائمہ فی یدی ولو لم اکن الا وحدی۔

"میں بس اُسی شخص سے جنگ پر تیار ہوں جو مجھ سے جنگ کرے اور اُسی پر حملہ کر سکتا ہوں جو مجھ پر حملہ کرے اور میں بدگمانیوں اور سوءِ ظن کی باتوں پر عمل نہیں کرتا ہاں جو شخص منھ در منھ میرے سامنے آئے اور بغاوت پر آمادہ ہو اُس کا تلوار سے مقابلہ کرونگا جب تک اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں رہے چاہے کوئی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو اور میں تنہا ہوں"(۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعمان بھی اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ مسلم کوئی باغیانہ قدم نہیں اٹھا رہے ہیں۔

اس کے بعد اُن اسباب کی بنا پر جو ہم نے "قاتلان حسین کا مذہب" رسالہ میں لکھے ہیں نعمان بن بشیر معزول کیا گیا اور عبداللہ بن زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا اور پرامن و صلح پسند۔ خاموش و گوشہ گزین مدینہ کا رہنے والا پردیسی مسافر (مسلم بن عقیل) بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۳۳

مگر افسوس ہے کہ حضرت مسلم بیعت کرنے والی جماعت کے جوش و خروش کو دیکھکر امام حسینؑ کو اطلاع دے چکے تھے کہ کوفہ کے لوگ آپ کی اطاعت پر آمادہ ہیں اور آپ کو تشریف لانا لازمی ہے ؟

اس کے بعد شریعت ظاہریہ کے اصول و اسباب کی بنا پر آپ کو کوفہ جانا ضروری ہوگیا تھا۔ آپ نے کوفہ جانے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ ایک دو۔ دس بیس نہیں۔ تین سو سے لے کر بارہ سو تک کے اندر اندر خطوط آچکے۔ آپ کے نمائندہ خصوصی حضرت مسلم کی تحریر آچکی کہ جلدی تشریف لائیے۔ لیکن اس کے بعد بھی حضرت زیادہ تعجیل کے ساتھ مکہ معظمہ سے روانگی پر آمادہ نہ تھے۔ خصوصًا جب کہ آپ حج کا احرام باندھ چکے تھے اور زمانہ حج کا بہت کم باقی تھا مگر نہ معلوم کیا تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنا ارادہ تبدیل فرمایا۔ اور بالکل جس طرح رسالتمآبؐ نے حج کو عمرہ سے تبدیل فرمایا تھا اُسی طرح آپ نے بھی طرز عمل اختیار کیا۔

کیا اس امر سے کسی خاص حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ ظاہری حالات سے تو کوئی امر نمایاں نہیں ہے اور نمایاں ہو تو کیونکر۔ اس لئے کہ مکہ معظمہ میں ظاہری طور پر کوئی فوج یا لشکر نہیں ہے۔ اگر بعیں

بدلے ہوئے مختلف لباسوں کے اندر کچھ اشخاص ہوں تو عام نگاہیں
انھیں دیکھیں کس طرح ؟

بے شک یہ راز اُس وقت کھلا جب امامؑ مکہ معظمہ سے روانہ
ہو چکے اور راستہ میں فرزدق شاعر نے حضورؑ کی خدمت میں
باریابی حاصل کی۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا ابن رسول اللہ اتنی
جلدی کاہے کی تھی کہ حج بھی نہ کیا؟ آپ نے فرمایا "اگر میں اتنی جلدی
نہ کرتا تو گرفتار ہو گیا ہوتا"

اسکے معنی یہ ہیں کہ مکہ معظمہ میں جو امن و امان کی جگہ ہے۔ جو خاموش
رہنے کا مقام ہے۔ جہاں پر جنگ و جدال جائز نہیں ہے کچھ لوگ
بھیجے گئے تھے حاجیوں کے لباس میں اور اُنھیں ہدایت تھی کہ
منیٰ میں، عرفات میں، حالت طواف میں، جس جگہ بھی حسینؑ گرفتار
ہو سکیں انھیں گرفتار کر لینا۔

یہ سبب تھا کہ امامؑ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی غور کرنے سے
یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاملہ کتنا اہم تھا اور خطرہ کس قدر نزدیک۔
جس شخص کو عبادت الٰہی کا انتہائی جذبہ و شوق ہو جس نے مرتے
مرتے عبادت ہی کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی ہو وہ حج کے
عین موقع پر حج کو ترک کر دے۔

یقیناً آپ کو یہی اندیشہ تھا کہ اگر آپ نے مکہ معظمہ میں قیام کیا تو بہت جلد آپ پر حملہ ہو جائے۔ بے شک اس کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہیں تحفظی تدابیر اختیار کیے جائیں۔ مگر اس میں تصادم کے امکانات بہت قریب تھے، لہٰذا جس طرح مدینہ سے نکلکر آپ نے ثابت کر دیا کہ مجھے جنگ کرنا منظور نہیں ہے۔ اُسی طرح اُس وقت جب حج قریب تھا مکہ معظمہ سے مہاجرت کر کے ثابت کر دیا کہ میں صعوبات سفر برداشت کروں گا لیکن خود جہاں تک ممکن ہو گا جنگ کا موقع پیش نہ آنے دونگا۔

امام حسینؑ کوفہ روانہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی تیاری کی ہے؟ سامان جنگ کیا ہے؟ کچھ نہیں بلکہ اس کے خلاف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے ساتھ مخدّرات عصمت ہیں اور بچے ہیں متعلقین ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر امن رہنا چاہتے ہیں۔ صبر و سکون منظور ہے، جنگ کیلیے نہیں جا رہے ہیں۔

متعلقین کو اپنے ساتھ لے کر سفر پر آمادہ ہونا یہ اعلان تھا امن پسندی کا۔ یہ اعلان تھا اس امر کا کہ ہم جنگ کا خیال تک دل میں نہیں رکھتے۔ اگر جنگ کا ارادہ ہوتا تو عورتوں اور بچوں کو چھوڑ جاتے، اور اپنے ساتھ نہ لیجاتے۔

راستہ طے ہونے لگا۔ کوفہ خطوط روانہ کیے گئے کہ ہم آرہے ہیں
مگر وہاں حالات میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ جناب مسلم سے فضا مخالف
ہو چکی اور اُن کی شہادت بھی ہو گئی۔

رسالتمآبؐ نے جس طرح سے امن پسندی کا ثبوت دیا تھا، وہی
طرزِ عمل اُن کے فرزند کے یہاں نمایاں ہے۔

رسالتمآبؐ جب مکہ معظمہ کے قریب پہونچے تھے تو مخالف جماعت
کے لشکر پر نظر پڑی تھی اور آپ نے اپنے راستہ کو بدل دیا تھا۔
اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہمیں لڑنا منظور نہیں ہے۔ اسی طرح حسینؑ
جا رہے ہیں، اور سامنے سے حُر کا لشکر آتے ہوئے نظر پڑا۔ تو آپ نے
راستہ بدل دیا اور داہنی طرف کا رُخ کر کے ذو حسم پہاڑ کے
دامن میں جا کر قیام کیا۔ (۱)

اس راستہ کے بدل دینے سے کیا یہ مطلب نہیں ثابت ہوتا
کہ اگر تم ہم سے کوئی روک ٹوک نہ کرتے تو ہم کوفہ جانے کے لیے
تیار تھے۔ مگر جب یہ سامان ہے تو چونکہ ہمیں جنگ منظور نہیں ہے
ہم کوفہ نہ جائینگے۔ کسی دوسری طرف چلے جائینگے۔

بیشک رسولؐ کی مخالف جماعت چونکہ خود جنگ کا جوش نہ رکھتی

(۱) تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو "مجاہدۂ کربلا" صہ۹

تھی۔ اور صرف جذبۂ عناد سے مجبور ہو کر مقابلہ پر آئی تھی۔ اس لیے اُس نے جب حضرت کو راستہ چھوڑتے ہوئے دیکھا تو واپس گئی مگر یہ آنے والی فوج خود تشدد پر آمادہ اور رواداری و صلح پسندی سے علحدہ تھی، اس لیے جدھر آپ کو متوجہ دیکھا اُسی طرف یہ لشکر بھی متوجہ ہو گیا۔

یہ ایک ہزار کی جمعیت تھی جو حُر بن یزید ریاحی کی قیادت میں حصین بن تمیم افسر افواج قادسیہ کی طرف سے روانہ کی گئی تھی۔

(عام طور سے واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں حصین بن نمیر کا نام لیا جاتا ہے اور اُس کے متعلق مختلف واقعات کی نسبت دیجاتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے

حصین بن نمیر سکونی شام کا باشندہ اور شامی افواج کا ایک افسر تھا جو وہیں دمشق میں مقیم تھا اور واقعۂ کربلا میں عراق کے حدود میں بھی موجود نہ تھا۔

لیکن یہ حصین جس کا تذکرہ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں ہے یہ حصین بن تمیم تمیمی ہے، جو کوفہ میں کوتوال کی حیثیت رکھتا تھا اور جس وقت امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف متوجہ ہونے کی اطلاع ملی ہے اور ابن زیاد کی طرف سے ناکہ بندی کا انتظام کیا جانے لگا ہے

تو اسکو دس ہزار کی فوج کیساتھ قادسیہ میں مقرر کیا گیا تھا کہ جو شخص کوفہ میں آنا چاہے اور جو باہر جانا چاہے اسکی دیکھ بھال اور نگہداشت ہو۔

یہ قادسیہ عین راستہ میں واقع تھا اور امام حسینؑ اگر مشہور و معروف راستہ سے آتے تو پہلے آپ کو قادسیہ پہونچنا پڑتا لیکن چونکہ آپ غیر معروف راستہ سے آرہے تھے اس لیے قادسیہ داہنے طرف چھوٹ گیا، اور مخبروں کے اطلاع دینے سے حصین کی جانب سے حُر بن یزید کو آپکے سدِ راہ ہونے کیلیے بھیجا گیا۔

عبداللہ بن یقطر اور قیس بن مسہر صیداوی اسی حصین بن تمیم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اور واقعہ کربلا میں بھی جن واقعات میں حصین کا نام ہے، جیسے نماز ظہر کی اجازت کے موقع پر حصین کا کہنا صلی تقابل اللہ، وہ بھی حصین بن نمیر نہیں حصین بن تمیم ہے۔
اور یہ حصین کربلا ہی میں امام علیہ السّلام کی بددعا سے جو آپ نے فرمادی تھی ہلاک ہو گیا۔ اور واقعہ کربلا کے بعد کے لیے باقی نہیں رہا۔ لیکن حصین بن نمیر وہ تو شام میں باقی رہا اور عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ کو جو فوج روانہ کی گئی تھی اُس کا افسر ہوا اور مکہ معظمہ کے محاصرہ اور خانہ کعبہ پر منجنیق کے ذریعہ سے سنگباری ایسے کارنامول کو اُس نے انجام دیا۔

حُر کی فوج کے ساتھ جو واقعات امام کو پیش آئے ان کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں ہے لیکن صرف اُس قدر جو ہمارے موضوع کلام یعنی ثبوت رواداری سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرتؑ کا سب سے پہلے فوج حُر کو سیراب کر دینا بہت بڑا اس کا ثبوت تھا کہ کوئی جنگجویانہ جذبہ کار فرما نہیں ہے۔ نماز ظہر کے وقت امام حسینؑ نے دونوں طرف کی فوج کے سامنے تقریر فرمائی جس میں ارشاد ہوا۔

انی لم اتکم حتیٰ اتتنی کتبکم وقدمت علیّ رسلکم ان اقدم علینا فانہ لیس علینا امام لعلّ اللہ ان یجمعنا بک علی الھدیٰ فان کنتم علیٰ ذالک فقد جئتکم فان تعطونی ما اطمئن الیہ من عھودکم ومواثیقکم اقدم مصرکم وان لم تفعلوا وکنتم لمقدمی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الذی اقبلت منہ الیکم۔

"میں نے اُسوقت تک تمہاری جانب آنے کا خیال نہیں کیا جب تک تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے اور قاصد نہیں پہونچے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے آپ آئیے، شاید آپ کی وجہ سے ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔

اب اگر تم اسی بات پر قائم ہو تو مجھ سے عہد و پیمان کرو اور میں تمھارے ساتھ کوفہ چلنے پر تیار ہوں۔ اور اگر تمھیں یہ منظور نہیں ہے اور میرا آنا نا گوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس جاتا ہوں"

کیا رواداری اور شورش انگیزی سے علیحدگی کا اس سے بڑھ کے ثبوت ہو سکتا ہے؟

فوج مقابل کی طرف سے کچھ جواب نہیں ملا۔ اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ عصر کے قبل پھر آپ نے تقریر فرمائی اور یہی کہا کہ "اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں واپس چلا جاؤں"

حُر نے خطوط کے معاملہ سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ حضرت نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا، اور انھوں نے دو خورجیاں بھری ہوئی خطوط کی سامنے لاکر پیش کر دیں۔

حُر نے کہا مجھے اس سب سے مطلب نہیں مجھے تو یہ حکم ہے کہ جہاں آپ ملجائیں آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے پاس لیچلوں۔

حضرت نے اس سے انکار فرمایا۔ آپ کا کوفہ کی طرف جانا۔ دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا یا آپ فاتحانہ صورت سے داخل ہوں یعنی راستہ کے انتظامی افواج کا قلع قمع کرتے۔ طاقت و اقتدار کے ساتھ کوفہ پر قابض ہوں، مگر اس صورت میں جنگ ناگزیر تھی اور یہ

حضرت کی امن پسندی اور صلح پروری کے خلاف تھا۔ اور یا آپ خاموشی کے ساتھ چلے جائیں۔ لیکن یہ اس وقت پر کہ جب فوج دشمن کی موجود ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے پاس لیجائے۔ اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں گرفتار کرانا ہے اور قید ہو کر دشمن کے پاس جانا ہے۔

اس لیے حضرت کے لیے امن پسندی اور خودداری دونوں باتوں کی حفاظت کے ساتھ کوفہ جانا ممکن نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں واپس جاتا ہوں۔ حُر نے کہا "یہ ممکن نہیں ہے" اور فوج سد راہ ہوئی

جہاں تک کہ زبانی گفتگو کا سلسلہ تھا، آپ الفاظ سے جواب دیتے رہے اور اپنے ارادہ پر مصر تھے۔ لیکن اب عملی تصادم کی نوبت آ گئی تھی۔ حُر کی فوج سامنے کھڑی تھی اور آگے بڑھنے کیلیے راستہ نہ دیتی تھی۔

صورت حال نازک تھی اور اصحاب کو بھی جوش پیدا ہو گیا تھا لیکن حضرت کو جنگ منظور نہ تھی۔

کافی ردوبدل ہونے کے بعد حُر نے یہ صورت پیش کی کہ آپ نہ تو کوفہ کی طرف جائیں اور نہ مدینہ کی طرف، بلکہ ایسا راستہ اختیار کریں جو کوفہ اور مدینہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کو گیا ہو حضرتؑ نے

اسے منظور فرمالیا اور یہ چاہا کہ جنگ نہ ہو۔ اگرچہ اس سلسلہ میں آپ
کسی ہی سرزمین پر پہونچ جائیں۔

اب ظاہری صورت سے کوئی مقصد امام کے پیش نظر نہیں ہے
کوفہ جانا منظور تھا مگر وہ ارادہ بدل چکا، مدینہ جانے کا قصد کیا،
اُسے فوج مخالف نے گوارا نہیں کیا۔ اب تیسری طرف کا رخ ہے
اور کوئی خاص منزل مد نظر نہیں ہے۔ لیکن جاتے جاتے ایک جگہ
پر جو پہونچے تو کوفہ کا قاصد حُر کے نام خط لاتے ہوئے نظر آیا۔ رواداری
کے خلاف تشدد کا مظاہرہ اس کا نام ہے۔

یہ خط ہے کوفہ کے حاکم عبید اللہ بن زیاد کا حُر بن یزید ریاحی کے
نام جس میں لکھا ہے۔

اما بعد فجعجع بالحسین حین یبلغک کتابی ویقدم علیک
رسولی فلا تنزلہ الا بالعراء فی غیر حصن وعلی غیر ماء وقد
امرت رسولی ان یلزمک ولا یفارقک حتی یاتینی بانفاذک
امری والسلام۔

"حسین کے ساتھ سختی سے کام لو اور حسین کو اُترنے پر مجبور کرو
ایک خشک زمین پر جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانا اور پینے کیلئے
پانی موجود نہ ہو میں نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ

ساتھ رہے جبتک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے؟"

یہ خط تھا جس کے بعد حُر امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور کہا۔

"دیکھیے یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے آپکے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ قاصد میرے ساتھ ہے اور میں حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں"

اس کے معنی یہ ہیں کہ اب حُر آگے بڑھنے سے مانع تھا۔ اور اتنی سختی کے ساتھ کہ حضرت نے فرمایا ہم کو اس قریہ میں قیام کر لینے دو جس کا نام نینوا ہے۔ یا اس میں جس کا نام غاضریہ ہے یا اس میں جس کا نام شفیہ ہے۔ مگر حُر نے کہا کہ مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو کسی آباد مقام پر نہیں بلکہ چٹیل میدان میں اترنے پر مجبور کروں جہاں پانی بھی قریب نہ ہو۔ اصحاب کو جوش پیدا ہو گیا۔ زہیر بن قین نے عرض کیا۔ یا ابن رسول اللہ ان قتال ھؤلاء اھون علینا من قتال من یاتینا من بعدھم۔ فرزند رسولؐ۔ ان لوگوں سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اُن افواج سے جنگ کے جو ان کے بعد آئیں گی لہذا ہم کو ان سے لڑ لینے دیجیے۔ مگر امام حسینؑ نے فرمایا ما کنت لابدأھم بالقتال۔

"میں جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتا" اس کے معنی یہ ہیں کہ

قیام کرلو یہیں جہاں یہ کہتے ہیں مگر لڑائی نہ ہونے پائے۔

قیام ہوگیا اور خیام آل محمد برپا ہوگئے اُس صحرا میں جس کا نام ہے کربلا۔

دیکھیے امام حسینؑ کس کس طرح جنگ سے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں مگر آپ کو کس طرح مجبور کیا جا رہا ہے۔

دوسرے ہی دن سے فوجوں کی آمد شروع ہوگئی مشہور صحابی سعد بن ابی وقاص کا لڑکا عمر کوفہ سے چار ہزار آدمیوں کی معیت میں آیا۔

ملک عجم میں بغاوت ہوئی تھی اور "دستبی" کے مقام پر قبیلہ دیلم نے غلبہ پاکر قبضہ کرلیا تھا۔

ابن زیاد نے عمر سعد کو اسی مہم کے لیے مامور کرکے چار ہزار کی فوج سپرد کی تھی اور حکومت رَے کا پروانہ بھی تحریر کر دیا تھا۔ اور ابن سعد اسی فوج کو ساتھ لیے ہوئے بیرون کوفہ مقام حمام اعین پر خیمہ زن تھا جب امام حسینؑ کا معاملہ پیش آیا تو ابن زیاد نے عمر سعد کو اسی فوج کی معیت میں کربلا جانے کا حکم دیدیا۔

یہ چار ہزار آدمی تو اس طرح پہلے سے تیار تھے ہی وہ ایک مرتبہ کربلا پہنچ گئے۔ اس کے بعد عام فوجی بھرتی شروع ہوگئی

اور حکم ہوا کہ جو شخص حسینؑ سے جنگ کے لیے نہ جائے گا اُس کا گھر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شام کا آدمی کسی ضرورت سے کوفہ آیا ہوا تھا اُس کو قتل بھی کرا دیا گیا کہ اہل کوفہ کے دل پر رعب چھا جائے اور وہ جنگ کیلیے روانہ ہونے میں پہلو تہی نہ کریں۔

عمر سعد نے کربلا آکر (چونکہ اُس کو احساس تھا کہ مجھے کس سے جنگ کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ جرم کتنا سنگین ہے) امام حسینؑ سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ امام حسینؑ کا طرز عمل اس نامہ و پیام کے جواب میں کیسا ہوتا ہے۔ کیا آپ اپنی طرف سے کچھ شرائط کو مسترد کرتے ہیں یا خود ایسے شرائط پیش کرتے ہیں جن میں صلح و آشتی کا جوہر کارفرما ہو۔ مگر دشمن اُن کو رد کرتا ہے۔

حضرت نے اپنی طرف سے عمرو بن قرظہ انصاری کو عمر سعد کے پاس روانہ فرمایا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کی افواج کے درمیان میں ملاقات کرنا۔ فخرج عمر بن سعد فی نحو من عشرین فارساً واقبل حسین فی مثل ذالک۔ عمر بن سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا۔ اور حضرت بھی تقریباً بیس جاں نثاروں کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے فلما التقوا امر حسین اصحابہ

ان تیمخوا عنہ وامر عمر بن سعد اصحابہ بمثل ذلک" جب دونوں آدمی قریب پہونچے تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا، کہ وہ آپ سے علیحدہ ہو جائیں جس پر عمر بن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا۔"

دیکھیے سواروں کو اپنے ساتھ لانے کی ابتدا عمر بن سعد کی طرف سے تھی۔ شاید اس خیال سے کہ مخالف کا سامنا ہے، معلوم نہیں صورت حال کیا پیش آئے۔

غالباً عمر سعد کی اس جمعیت کو ساتھ دیکھ کر امامؑ کے ساتھ اصحاب خود ہو گئے ہوں گے۔ کہ پھر ہم بھی آپ کو تنہا نہ جانے دیں گے۔ لیکن اصحاب کو علیحدہ کرنے میں پہل حضرتؑ کی طرف سے ہے۔ اس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ خالص نیت اور صاف دل اور صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کرنے کا ارادہ ہے جس میں فوج و جمعیت کی ضرورت نہیں ہے۔ جب عمر سعد نے یہ دیکھا کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں۔ اور ساتھیوں کو الگ کر دیا ہے تو اس نے بھی اپنے ساتھیوں کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا۔

راوی کا بیان ہے کہ ہم لوگ سب ہٹ گئے اس طرح کہ نہ ہمیں بات چیت معلوم ہوتی تھی نہ آواز سنائی دیتی تھی۔ گفتگو بہت دیر

تک ہوئی۔ یہاں تک کہ رات کا بڑا حصہ گذر گیا۔ پھر ہر ایک اپنی جماعت کی طرف واپس گیا۔

گفتگو صیغہ راز میں تھی۔ مگر لوگوں کو ایسے مواقع پر خواہ مخواہ کے لیے قیاس آزمائی کا شوق ہوتا ہے۔ یزید کے ہوا خواہوں نے طرح طرح کی باتیں بنا ڈالیں۔ یہاں تک کہا کہ امام حسینؑ عمر سعد سے کہتے تھے کہ مجھے یزید کے پاس لیچلو۔ میں اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ پر رکھدونگا۔

لیکن عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ جب سے امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے اور کوفہ پہونچے۔ وہاں اور یہاں اور راستہ میں کبھی حضرت کی زبان سے یہ نہیں نکلا کہ مجھے یزید کے پاس لیچلو، میں اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ پر رکھدوں گا۔

بیشک جس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے وہ یہ ہے، کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ مجھے دور دراز حدود ممالک اور اجنبی شہروں میں چلا جانے دو تاکہ تمھیں اطمینان حاصل ہو۔ اور مجھ سے خطرہ باقی نہ رہے۔

عمر سعد نے احساس کیا کہ امام حسینؑ کا طرز عمل صلح پسندانہ اور روادارانہ ہے۔ اُس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ امام حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں، وہ لکھتا ہے کہ

"مبارک ہو! خدا نے فتنہ کی آگ کو فرو کیا اور مسلمانوں کے شیرازہ کو مجتمع کیا اور امت اسلامی کے امر کی اصلاح کی۔

حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ میں جہاں سے آیا ہوں واپس جاؤں یا دور دراز ممالک میں چلا جاؤں۔

پھر عمر سعد اپنی ذاتی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

هذا لكم رضى وللامة صلاح۔

"میرے خیال میں یہ بات ایسی ہے جو تم لوگوں کی مرضی کے مطابق اور امت اسلامی کے صلاح و فلاح کا باعث ہے۔"

طبری میں ہے کہ ابن زیاد نے بہت خوشی کے ساتھ اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا۔

هذا كتاب رجل ناصح لاميره مشفق على قومه قد قبلت

"یہ ایسے شخص کا سا خط ہے جو اپنے امیر کا خیر خواہ اور اپنی قوم کا ہمدرد ہو۔ بے شک مجھے منظور ہے۔" مگر شمر بگڑ گیا، اور کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے؟ حسینؑ آپ کے پاس پہلو میں آ گئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیے کہ قوت و

عزت اُنہی کا حق ہے، اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصہ۔ میری
رائے میں کبھی اُن کی یہ خواہش منظور نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسمیں
بڑی ذلت ہے اور کمزوری کی دلیل ہے۔ بے شک انھیں آپ کے
حکم پر راضی ہو جانا چاہیے۔ یعنی وہ یہ کہدیں کہ جو ابن زیاد میرے
ساتھ چاہے سلوک کرے۔ اگر آپ انھیں قتل کرنا چاہیں تو آپ کا
حق ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی آپ کو اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد
اُس کا کیا ذکر، میں نے تو سُنا ہے کہ پوری پوری راتیں حسینؑ کے ساتھ
باتوں میں گذر جاتی ہیں۔"

ابن زیاد پر دنیا طلبی کے جذبات غالب آگئے اور اُس نے کہا
نعم ما رأیت الرأی رأیک "کیا کہنا تیرا۔ رائے تو تیری رائے ہے"
اس کے بعد اُس نے شمر کو بلا کر ایک خط اُس کے سپرد کیا،
اور کہا یہ خط میرا عمر سعد کے پاس لیجاؤ اور اُس سے کہو کہ وہ حسینؑ
اور اصحاب حسینؑ کے سامنے میرے حکم کی پابندی کا مطالبہ پیش
کرے۔ اگر وہ منظور کریں تو وہ اُن کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس
بھیجدے، اور اگر وہ انکار کریں تو اُن سے جنگ کرے۔ اگر عمر سعد اس
حکم کی تعمیل کرے تو خیر نہیں تو وہ معزول ہے اور تم اُس کی جگہ سردار
لشکر ہو۔ تم جنگ کرنا اور عمر سعد کو قتل کر کے اُس کا سر میرے پاس بھیجدینا

وہ خط جو عمر سعد کے نام تھا حسب ذیل ہے :-

اما بعد فانی لم ابعثک الی حسین لتکف عنہ ولتطاولہ ولا

لتمنیہ السلامۃ والبقاء ولا لتقعد لہ عندی شافعا انظر فان نزل

حسین واصحابہ علی الحکم واستسلموا فابعث بھم الی سلما و

ان ابوا فازحف الیھم حتیٰ تقتلھم ـــــــــ ان انت

مضیت لامرنا فیہ جزیناک جزاء السامع المطیع وان ابیت

فاعتزل عملنا وجندنا وخل بین شمر بن ذی الجوشن وبین العسکر

فانا قد امرناہ بامرنا والسلام۔

"میں نے تجھ کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تو ان کے ساتھ

مراعات کرے یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دے یا ان کو زندگی

کی امیدیں دلائے یا میرے پاس بیٹھ کر ان کی سفارش کرے۔ دیکھ

اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب سب میرے حکم کے اوپر رضامند ہوں اور

جو میں ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہوں اس کو منظور کرلیں تو ان کو

آہستگی کے ساتھ میرے پاس بھیجدے، اور اگر انکار کریں تو ان کے

اوپر حملہ کردے۔ یہاں تک کہ انھیں قتل کر ڈالے"

اس کے بعد انتہائی سخت اور تشدد آمیز احکام کیفیت شہادت

اور اس کے بعد کے متعلق ہیں جو کسی طرح انسانیت و شرافت سے

حدود میں داخل نہیں ہیں۔ اور اُس کے بعد یہ ہے کہ اگر تو نے ان احکام کا اجرار کیا تو خیر۔ تجھے معاوضہ ملے گا۔ وہ جو ایک وفادار اطاعت گذار کو ملنا چاہیئے۔ اور اگر تو نے اسے منظور نہ کیا تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جا اور اُسے شمر کے سپرد کر دے جس کو ہمنے کافی ہدایتیں کر دی ہیں"

شمر یہ خط لیکر کربلا پہونچا اور عمر سعد کو دیا۔

دیکھیے شہامت طبع ایسی تو ہو۔ ثبات قدم اور استقلال ایسا ہو جس کا دشمن بھی احساس رکھتے ہوں اور اُس کا اعتراف کرتے ہوں عمر سعد نے خط دیکھا اور بغیر اس کے کہ امام حسینؑ کے پاس جا کر اُسکے مضمون کی اطلاع دے۔ اُس نے اپنے مقام ہی پر کہدیا، اور شمر سے خطاب کیا۔

مالک ویلک لا قرب اللہ دارک وقبح اللہ ما قدمت بہ علی واللہ انی لاظنک انت ثنیتہ ان یقبل ماکتبت بہ الیہ افسدت علینا امرا کنا رجونا ان یصلح لا یستسلم واللہ حسین ان نفسا ابیۃ لبین جنبیہ۔

"یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے۔ خدا تجھے غارت کرے۔ اور برا کرے اس پیغام کا جو تو میرے پاس لایا ہے۔ خدا کی قسم میرا

خیال ہے کہ تو ہی نے ابن زیاد کو میرے مشورہ کے قبول کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بنجانے کی ہم کو امید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے تئیں ابن زیاد کے رحم و کرم پر نہ چھوڑینگے یقیناً حسینؑ ایک غیور دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں"

یہ تھا آپ کا استقلال کہ جس کا دشمن کے دل پر اثر قائم تھا اور وہ کہتا تھا کہ

"اُن کے پہلوؤں کے اندر ایک ذلت سے انکار کرنے والا۔ ایک خود دار دل ہے"

شمر نے کہا کہ ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ اب کروگے کیا؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل کروگے یا سرداری لشکر میرے سپرد کروگے؟" عمر سعد نے چار و ناچار کہا کہ "نہیں میں خود ہی اس حکم پر عمل کروں گا۔ سپہ سالاری ترک کرنا مجھے منظور نہیں ہے"

اب عمر سعد کو فکر ہوگئی کہ کہیں جلدی حملہ ہو جائے، تاکہ میری وفاداری و خیر خواہی میں کمی نہ ثابت ہو۔ نویں تاریخ کا دن قریب ختم اور عصر کا وقت بھی منقضی ہو چکا تھا۔ شام کا وقت قریب تھا، جب عمر سعد نے حکم دیدیا کہ پوری فوج حسینؑ اور اصحاب حسینؑ پر ٹوٹ پڑے۔ اچانک۔ بلا اطلاع۔ امام حسینؑ اپنے خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا

سہارا لیے ہوئے۔ گھٹنوں پر سر رکھے کچھ غنودگی کے عالم میں۔ کہ ایک مرتبہ
دشمن کی حملہ آور فوج کے شور وغل کی آواز خیمہ میں گئی اور جناب زینبؑ
کے کان میں پہونچی، اور آپ مضطرب ہو گئیں۔ امام حسینؑ کو بیدار کیا۔
حضرتؑ نے جناب عباسؑ کو بلایا، فرمایا جاؤ دیکھو تو واقعہ کیا ہے اور
یہ ناگہانی حملہ کیسا ہے؛ جناب عباسؑ بیس انصار کے ساتھ تشریف
لے گئے۔ فرمایا۔ ما بدا لکم وما تریدون۔

تمھاری رائے کیسے بدلی اور کیا چاہتے ہو؟"

معلوم ہوا ابن زیاد کا خط آیا ہے کہ یا امام اپنے تئیں اُس کے
رحم وکرم کے حوالہ کر دیں، اور یا جنگ کیجائے۔"

آپ نے فرمایا کہ ٹھہرو میں حضرت سے دریافت کر لوں پھر جواب دونگا
فانصرف العباس راجعا یرکض الی الحسین یخبر بالخبر۔

"جناب عباس گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام کی خدمت میں
حاضر ہوئے کہ آپ سے صورت حال کا تذکرہ کریں۔"

بیس آدمی جو ساتھ گئے تھے وہ دشمن کے مقابل کھڑے رہے
اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر یہ چاہا کہ تبلیغ کے فرض کو انجام دے لیں۔
حبیب ابن مظاہر نے زہیر بن القین سے کہا کہ دل چاہے تو ان لوگوں
سے کچھ باتیں کر لو اور نہیں، کہو تو میں گفتگو کروں۔ زہیر نے کہا "تمھارے

ہی دل میں خیال آیا ہے تو تمھیں گفتگو بھی کرو۔"

حبیب بن مظاہر نے مخالف فوج کے سامنے تقریر شروع کی، کہنے لگے۔ اما واللہ لبئس القوم عند اللہ غدا قوم یقدمون علیہ قد قتلوا ذریۃ نبیہ وعترتہ واھل بیتہ وعباد اھل ھذا المصر المجتھدین بالاسحار والذاکرین اللہ کثیرا۔"کیوں مسلمانو! کیا اُس جماعت سے بڑھ کر روزِ قیامت کوئی قوم رسوا ہوگی جو اس طرح خدا کا سامنا کرے کہ اُس نے اپنے نبی کی اولاد کو قتل کیا ہو اور اُنکی عترت و اہلبیت کا خون بہایا ہو۔ اور اس شہر کے اُن عبادت گذار بندوں کو قتل کیا ہو جو راتوں کو جاگ کر بسر کرتے اور خدا کے ذکر میں برابر مصروف رہتے تھے۔"

گفتگو ہو رہی تھی کہ جناب عباسؑ واپس آئے، کہا "امامؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی ہے۔ صبح کو دیکھا جائیگا۔"

عمر سعد کے لیے شمر کی موجودگی انتہائی وحشت انگیز۔ اُس کو اپنی وفاداری و خیر خواہی کا ثبوت بہم پہنچانا۔ سرداری لشکر کہیں ہاتھ سے نہ جائے۔ حاکم کے خیالات خراب نہ ہوں۔ وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا۔ کہا "کیوں تمھاری کیا رائے ہے؟"

اُس نے کہا "جو امیر کی رائے۔"

"میری تو رائے ہے کہ مہلت نہ دیجائے"۔ یہ عمر سعد کا انتہائی تشدد آمیز رویہ تھا جو اُس نے صرف سالاری لشکر کے چلے جانے کے خوف میں اختیار کیا تھا۔

پھر دوسرے سرداران لشکر کی طرف متوجہ ہوا "کیوں تمھاری کیا رائے ہے"؟ عمرو بن حجاج زبیدی نے کہا۔ سبحان اللہ واللہ لو کانوا من الدیلم ثم سألوک ھذہ المنزلۃ لکان ینبغی لک ان تجیبھم الیھا۔ واہ۔ اگر کفار ترک و دیلم بھی ہوتے اور وہ اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو اُنکے ساتھ اتنی رعایت کرنا چاہیے تھی"۔

قیس بن اشعث نے بھی کہا کہ "خواہش منظور کرو اور مہلت دیدو"

یہ ایک رات کی مہلت تھی جو لے لی گئی۔ کیا کسی جنگ کی تیاری کے لیے؟ نہیں صرف خدا کی عبادت کے لیے۔ نماز و تہجد کیلیئے۔

شب گذری اور نہیں کہنا چاہتا کس طرح گذری۔ صبح ہوئی اور عاشور کی قیامت خیز صبح۔ پیمانہ لبریز ہے۔ پانی سر سے اونچا ہے۔ حملہ ہو چکا اور کوئی امید صلح کی باقی نہیں رہی لیکن حسین اب بھی امن پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہی مثال ناممکن ہے۔ اتمام حجت کی اتنی منزلیں۔ امن پسندی کے اتنے مظاہرات۔ ایک ایسے شخص کی طرف سے جو اپنی جان کے خوف سے

ایسا نہ کر رہا ہو جس نے موت کو اپنی آخری منزل سمجھ لیا ہو۔ اور اس کا اعلان کرتا رہا ہو۔ جو موت کا استقبال کشادہ پیشانی کے ساتھ کرنے پر تیار رہو (جیسا کہ واقعات نے یقینی طور پر ثابت کر دیا ہے) اس کے بعد یہ امن پسندی، یہ صلح پروری، یہ اشتعال سے علیحدگی، یہ اپنے جوش کی روک تھام۔ یہ اپنے ساتھیوں کے جذبات کی نگہداشت۔

یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کی منزل طے کر رہے تھے۔ جہادِ اصغر کے ساتھ جہادِ اکبر کا فرض ادا کر رہے تھے۔

حسینؑ نے صبح کی میدان جنگ میں۔ رات بھر کے جاگے۔ خدا کی عبادت کیے۔ نمازِ صبح کے فرض سے فراغت پاتے ہی دشمن کی صفوں کا سامنا، مگر اب امام کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے۔

یاد رکھیے۔ جنگ کی سواری ہے گھوڑا۔ عام سفر کی سواری ہے ناقہ۔ اس لیے عرب میں سفر کو جو جاتے تھے تو گھوڑا ساتھ رکھتے تھے کہ جنگ ہوگی تو گھوڑے پر سوار ہو لیں گے۔

ناقہ ہے امن کی سواری۔ فوج کی ترتیب ہو چکی مگر حسینؑ ناقہ طلب کرتے ہیں۔

ناقہ پر سوار ہوئے۔ قرآن اپنے ہاتھ میں لیا۔ صفوف لشکر کے سامنے

تشریف لائے تقریر شروع کی اور بلند آواز سے، جو فوج کے اکثر حصہ تک پہونچ سکتی تھی، ارشاد فرمایا۔

(ایھا الناس اسمعوا قولی ولا تعجلوا حتی اعظکم بالحق لکم علی۔

"ایھا الناس، میری بات سنو، جلدی نہ کرو، یہاں تک کہ میں تمکو نصیحت کروں اس حد تک جو تمھارا حق ہے میرے اوپر (کہ تمھیں بے خبر نہ رہنے دیا جائے اور حقیقت حال سے مطلع کر دیا جائے جسکے بعد اتمام حجت میں کوئی کمی نہ رہے۔ یہ ہے ایک ہادی برحق کی شان کہ ایسے سخت موقع پر بھی ہدایت میں کوتاہی نہیں کرتے۔ امامت کے فرض کو انجام دے رہے ہیں) وحتی اعتذر الیکم من مقدمی علیکم فان قبلتم عذری وصدقتم قولی واعطیتمونی النصف کنتم بذلک اسعد ولم یکن لکم علی سبیل وان لم تقبلوا منی العذر ولم تعطوا النصف من انفسکم فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا الی ولا تنظرون ان ولیی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمھارے سامنے اپنا عذر پیش کردوں، کہ میں کیوں آیا اور کس لیے تمھارے شہر کا رخ کیا؟ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کیا اور میرے کہے کو مانا اور میرے ساتھ انصاف کیا

تو یہ تمھاری خوش قسمتی ہوگی اور تم کو اُس وقت میرے خلاف قدم اٹھانے کا کوئی حق معلوم نہ ہوگا۔ اور اگر تم نے میرے عذر کو نہ مانا اور انصاف کرنا نہ چاہا تو مجھ کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تم اور جس جس کو چاہو۔ تمام دنیا کی جماعتوں کو اپنے ساتھ متفق کرلو۔ اور میری مخالفت پر ہم آہنگ ہو جاؤ۔ پھر دیکھو کوئی حسرت تمھارے دل میں نہ رہ جائے۔ اور پوری طاقت سے میرا خاتمہ کردو۔ مجھے ایک لحظہ کی بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ تو بس خدا پر ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور اچھے اعمال والوں کا وہی مددگار ہے "

جب آپ کا خطبہ یہاں تک پہونچا تو مخدرات عصمت سے جو حضرت کی تقریر پر گوش بر آواز تھیں گریہ کا شور بلند ہوا حضرت نے جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ ابھی کیا ہے؟ رونے کا موقع تو زیادہ بعد کو آئیگا۔

جب رونے کی آواز موقوف ہوئی تو حضرتؑ نے حمد خدا ادا فرمائی اور حمد و صلوٰۃ میں بہت دیر تک اپنی زبان کو مصروف رکھا۔ یہ اطمینان قلب ہے۔ یہ ثبات قدم ہے۔ جس کا تاریخ میں ان الفاظ میں تذکرہ ہی کہ

حمد اللہ واثنیٰ علیہ وذکر اللہ بما ھو اھلہ وصلی علی محمد صلی اللہ علیہ وعلی ملٰئکتہ وانبیائہ نذکر من ذلک ما اللہ اعلم

وما لا یحصی ذکرہ۔

"حمد خدا ادا کی اور حضرت احدیت کے اُن اوصاف کا تذکرہ کیا جو اُس کی شان جلال و کمال کے لائق ہیں۔ اور جناب رسالتمآب پر درود بھیجا اور بہت دیر تک حضرت کے اوصاف کو بیان فرمایا۔

راوی بیان کرتا ہے۔ فواللہ ما سمعت متکلما قط قبلہ ولا بعدہ ابلغ فی منطق منہ۔

"خدا کی قسم اُس دن کے قبل اور اُس دن کے بعد میں نے حضرت کا ایسا فصیح البیان مقرر نہیں دیکھا۔"

پھر فرمایا۔ اما بعد فانسبونی فانظروا من انا ثم ارجعوا الی انفسکم وعاتبوھا فانظروا اھل یحل لکم قتلی وانتھاک حرمتی۔

"ذرا میرا نام و نسب تو بتلاؤ۔ ذرا دیکھو تو کہ میں کون ہوں؟ پھر خود اپنے نفسوں کی طرف رجوع کرو، اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو، اور خود اپنے سے جواب طلب کرو غور کرو کہ تمھارے لیے میرا خون بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟"

الست ابن بنت نبیکم وابن وصیہ وابن عمہ واول المومنین باللہ والمصدق لرسولہ بما جاء بہ من عند ربہ "کیا میں نہیں ہوں تمھارے نبی کا نواسا اور اُن کے وصی اُن کے چچازاد بھائی

اور اُن کے اوپر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کا فرزند؟"

اولیس حمزة سید الشہداء عم ابی "کیا حمزہ جنھیں متفق طور پر سید الشہداء کہتے ہو وہ میرے باپ کے حقیقی چچا نہیں تھے؟ اولیس جعفر الشہید الطیار ذوالجناحین عمی "کیا جعفر طیار جنھیں بعوض شہادت خدا نے دو پر پرواز عطا کیے میرے ہی چچا نہیں تھے؟" اولم یبلغکم قول مستفیض فیکم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم قال لی ولاخی ھذان سیدا شباب اھل الجنۃ "کیا یہ حدیث تمھارے گوش زد نہیں ہوئی جو زبان زد خلائق ہے کہ حضرت رسولؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔"

فان صدقتمونی بما اقول وھو الحق واللہ ما تعمدت کذبا مذ علمت ان اللہ یمقت علیہ اھلہ ویضر بہ من اختلقہ "اگر تم مجھے سچا سمجھتے ہو اور میری بات کو سچ جانتے ہو (اور وہ حقیقۃً سچی ہی ہے۔ اس لیے کہ جب سے میں سن تمیز کو پہونچا کبھی کوئی کلمہ میری زبان سے جھوٹ نکلا ہی نہیں) تو خیر۔" وان کذبتمونی فان فیکم من ان سألتموہ عن ذلک اخبرکم سلوا جابر بن عبد اللہ

الانصاری او ابا سعید الخدری او سہل بن سعد الساعدی او زید بن ارقم او انس بن مالک یخبروکم انھم سمعوا ھذہ المقالۃ من رسول اللہؐ لی ولاخی۔" اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص موجود ہیں کہ اگر تم اُن سے دریافت کرو تو وہ تمھیں بتلا دیں گے۔ دریافت کرو جابر بن عبد اللہ انصاری سے۔ ابو سعید خدری سے۔ سہل بن سعد ساعدی سے۔ زید بن ارقم سے۔ انس بن مالک سے۔ یہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے اپنے کانوں سے رسالتمآبؐ کو یہ حدیث فرماتے ہوئے سنا۔ افما فی ھذا حاجز لکم عن سفک دمی۔

"کیا رسالتمآبؐ کی یہ حدیث تم کو میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے"؟

فان کنتم فی شکّ من ھذا القول افتشکون انی ابن بنت نبیکم فواللہ ما بین المشرق والمغرب ابن بنت نبیّ غیری منکم ولا من غیرکم۔ انا ابن بنت نبیکم خاصۃ۔

اچھا۔ اگر اس حدیث میں تم کو شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں کسی نبی کا نواسا میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ بس

میں ہی ہوں جو خاص تمہارے نبی کا نواسا ہوں۔ یعنی یہودیوں کے نبی کا نہیں۔ نصاریٰ کے نبی کا نہیں۔ خاص تم مسلمانوں کے نبی کا نواسا ہوں۔

اخبرونی اتطلبونی بقتیل منکم قتلتہ او مال لکم استھلکتہ او بقصاص من جراحۃ۔ "ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر کیوں آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا بدلہ لیتے ہو جو میرے ہاتھ سے قتل ہوا ہے، یا کسی مال کا اپنے مطالبہ کرتے ہو جسے میں نے تلف کر دیا ہے یا کسی زخم کا قصاص چاہتے ہو؟"۔

ایک خاموشی سی چھائی رہی اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا جس کے بعد حضرتؑ نے خاص طور سے شبث بن ربعی۔ حجار بن ابجر۔ قیس بن اشعث۔ یزید بن حارث کو آواز دی اور فرمایا۔ الم تکتبوا الی ان قد اینعت الثمار واخضر الجناب وطمت الاجام وانما تقدم علی جند لک مجند۔

"کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ میوے پختہ و رسیدہ ہیں، کھیتیاں لہک رہی ہیں۔ چشمے پُر آب ہیں۔ لشکر آپ کی امداد کیلئے تیار ہیں"۔

ان لوگوں نے (یہ جرأت دیکھنے کے قابل ہے) پکار کر کہا ہم نے تو نہیں لکھا تھا"۔

حضرتؑ نے فرمایا۔ سبحان اللہ بلٰے واللہ لقد فعلتم یوں انکار کرنے کو انکار کرو مگر خدا کی قسم تم نے لکھا تھا اور ضرور لکھا تھا۔

پھر حضرت عام لشکر کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا۔

ایھا الناس اذکرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الیٰ مأمنی من الارض۔ " جب تمھیں میرا آنا ناگوار ہے تو مجھے واپس چلا جانے دو ایسی جگہ جہاں میں امن وامان سے زندگی کے دن بسر کرسکوں۔"

(یہ وہی مطالبہ ہے جو حضرتؑ نے حُر کی فوج کے سامنے کیا تھا۔ اور وہی آج پیش ہو رہا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کا مسلک امن وامان کی حفاظت اور جنگ سے کنارہ کشی کا جو پہلے تھا وہ برابر قائم رہا۔ نہ تو بعد کے حالات سے مشتعل ہو کر اُس مسلک سے منحرف ہوئے اور نہ یہی ہے کہ بعد کے حالات سے مجبور ہو کر موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس مسلک کو آپ نے اب اختیار کیا ہے)

قیس بن اشعث نے (یہ محمد بن اشعث کا بھائی ہے اور جعدہ بنت اشعث اس کی بہن۔ جعدہ وہ کہ جو امام حسنؑ کو زہر خورانی کی براہ راست ذمہ دار اور محمد بن اشعث وہ کہ جو حضرت مسلمؑ کی مخالف فوج کا سردار اور آپ کی گرفتاری کا بانی اور قتل کا ذمہ دار

یہ قیس انہی دونوں بھائی بہن کا بھائی ہے) پکار کر کہا "تو کیوں آپ یزید کی بیعت نہیں کر لیتے"؟

حضرتؑ نے فرمایا "ہاں کیوں نہ ہو۔ تو اُسی اپنے بھائی کا تو بھائی ہے جس نے مسلمؑ کو قتل کیا ہے"۔ لا واللہ لا اعطیھم بیدی اعطاء الذلیل ولا اقر اقرار العبید عباد اللہ انی عذت بربی و ربکم ان ترجمون اعوذ بربی و ربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب۔

"خدا کی قسم یہ تو نہ ہو گا کہ میں اپنے کو ذلت کے ساتھ انکے سپرد کر دوں اور غلامانہ زندگی کا اپنے لیے اقرار کر لوں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میرے دامن پر کوئی دھبہ آئے۔ میں پناہ مانگتا ہوں ہر اُس جابر و سرکش سے جو روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا"۔

حجت تمام ہو چکی اور تقریر ختم ہوئی حضرتؑ نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا کہ ناقہ کو باندھ دو۔ آپ ناقہ سے اتر آئے اور وہ باندھ دیا گیا۔[۱]

دیکھیے امام حسینؑ جس اصول پر ابتداء سے قائم تھے اُسی پر

---

[۱] طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۲-۲۴۳۔

آخر تک قائم رہے۔ آپ نے یہ کہا کہ مجھ کو کسی طرف چلا جانے دو۔ مجھ کو پہاڑوں کی طرف نکل جانے دو۔ مگر کوئی بات منظور نہ ہوئی۔ سوال تھا اور بس ایک کہ اپنے تئیں ابن زیاد کے سپرد کر دیجیے یزید کی بیعت کر لیجیے۔" وہ کہ جسے حسینؓ مذہب کی پامالی سمجھتے تھے۔ اُس کو حسینؓ نے گوارا نہ کیا۔ یہ چیز ایسی تھی جس نے نمایاں طور پر ظاہر کر دیا، کہ آپ کے خلاف جو جماعت ہے وہ بالکل سختی پر آمادہ ہے۔ اُس کو اخلاق اور شائستگی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ وہ چیز ہے جس نے ایسے لوگوں پر بھی اثر ڈالا جو حسینؓ کے مخالف تھے۔ اور بعض نیک بندے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے یزید کے لشکر سے کنارہ کشی کر لی اور امامؑ کا ساتھ دیا جیسے حُر بن یزید ریاحی، وہی حُر جو کل امامؑ کے لیے سدِّ راہ بنا تھا اور گھیر کر کربلا لایا تھا۔ آج وہ ضمیر کی ہدایت سے مجبور ہوتا اور ابن سعد کی ہمراہی ترک کر دیتا ہے۔ جو چیز اُس پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی تھی وہ انہی امام حسینؓ کے صلح پسندانہ مطالبات کا مسترد ہو جانا جیسا کہ تاریخ میں ہے۔ جس وقت لشکر صف آرا ہو چکا تو حر بن یزید عمر سعد کے پاس آیا اور کہا۔ (مقاتل انت هذا الرجل) کیا تم اس شخص (حسینؓ) سے واقعی جنگ کرو گے؟"

عمر سعد نے کہا۔ ای واللہ قتالا ایسرہ ان تسقط الرؤس وتطیح الایدی۔

"بیشک۔ ایسی سخت جنگ جس کا معمولی نتیجہ یہ ہے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ کٹ کٹ کے زمین پر گرتے ہوں"۔

حُر نے کہا۔ فما لکم فی واحدۃ من الخصال التی عرض علیکم رضا۔

"کیوں یہ اتنے مطالب حسینؑ نے پیش کیے۔ ان میں سے کوئی تمھاری منظوری کے قابل نہیں ہے"۔

اُس نے کہا۔ واللہ لو کان الامر الی لفعلت ولکن امیرک قد ابی ذلک۔

"خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں منظور کر لیتا۔ مگر کیا کروں تمھارا حاکم (ابن زیاد) نہیں مانتا"۔

حُر عمر سعد سے گفتگو کو بیکار سمجھ کر اُس سے علیحدہ ہوا۔ قرہ بن قیس حُر کے قبیلہ کا شخص اس کے ساتھ تھا۔ اُس کو یہ کہکر اپنے پاس سے ٹالنا چاہا کہ "قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا"۔ قرہ نے کہا "ابھی پلائے لاتا ہوں"۔ قرہ گھوڑے کو پانی پلانے گیا اور حُر آہستہ آہستہ حسینؑ کے لشکر سے نزدیک ہونے لگا۔ مہاجر بن اوس جو اُنھی کے قبیلہ کا ایک دوسرا شخص تھا

اُس نے کہا "کیوں کیا حملہ کرنے کا ارادہ ہے؟" حُر نے کوئی جواب نہیں دیا، جسم میں لرزہ کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

مہاجر نے کہا "حُر یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ تو میں تمہارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ پھر یہ جو میں اس وقت دیکھ رہا ہوں یہ کیا ہے؟"

حُر نے کہا میرے سامنے اس وقت جنت اور دوزخ کا سوال پیش ہے۔ خدا کی قسم میں تو جنت کے اوپر کسی چیز کو مقدم نہیں سمجھتا ہوں چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے" یہ کہتے کہتے گھوڑے کو چابک لگایا اور آن واحد میں حسینی لشکر میں پہنچ گیا۔ (۱)

ایک دوسرا اجابر۔ یزید بن زیاد بن مہاجر۔ اس کے متعلق تاریخ میں یہ ہے کہ کان ممن خرج مع عمر بن سعد الی الحسین فلما ردوا الشروط علی الحسین مال الیہ فقاتل معہ حتی قتل۔ (یہ بھی عمر سعد کی فوج میں اُس کے ساتھ آئے تھے لیکن جب امام حسینؑ کے مطالبات کو نامنظور کیا گیا تو یہ امام حسینؑ

(۱) طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۴۔

کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور آپ کی حمایت میں جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے (۱)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؓ کے طرز عمل میں صلح پسندانہ پہلو اس درجہ نمایاں تھا جس کا دشمنوں پر اثر پڑ رہا تھا اور وہ آپ کے ہمدرد بن رہے تھے۔

آپ اپنے طرز عمل سے برابر یہ ثابت کرتے رہے کہ میں اپنی طرف سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔ اُس وقت کہ جب امام خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ کے دروازہ پر کھڑے تھے اور خیمہ کی پشت پر خندق میں آگ بھڑک رہی تھی، ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق اُس طرف سے گذرا اور خیموں کے اوپر نظر ڈالی تو چاروں طرف اُن کے آگ مشتعل نظر آئی۔ اُس نے پکار کر انتہائی سخت الفاظ میں ایک جملہ کہا، جسے سُنکر اصحاب بےچین ہو گئے۔ امام نے فرمایا "یہ کون ہے؟ غالباً شمر بن ذی الجوشن ہے۔" اصحاب نے عرض کیا "ہاں فرزند رسولؐ، یہ وہی ہے۔" حضرت نے فرمایا۔

"جہنم کی آگ میں جلنے کا مستحق تو ہے۔"

(۱) طبری۔ ج ۶ ص ۲۵۵

مسلم بن عوسجہ نے جو نہایت ضعیف العمر ہو چکے تھے، مگر جملہ ایسا تھا کہ تمام اصحاب میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔ عرض کی جعلت فداك الا ارمیه بسهم فانه قد امکننی ولیس یسقط سهم فالفاسق من اعظم الجبارین۔ "میری جان آپ پر نثار۔ اجازت ہوتی ہے کہ ایک تیر ماردوں؟ اس وقت یہ بالکل زد پر آگیا ہے، تیر خطا نہیں کرے گا، اور آدمی بڑا فاسق و فاجر ہے"۔

حضرت نے فرمایا لا ترمه فانی اکره ان ابدأهم "نہیں ایسا نہ کرنا، میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا" (۱)

تاریخ ان واقعات سے مملو ہے۔

دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا۔ لڑائی کا عام قانون تھا کہ بڑے سے بڑے بہادر اور شہسوار بھی جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔ امیر المومنینؑ جن کی شجاعت کا دنیا میں سکہ قائم ہے وہ بھی جنگ میں زرہ پوش ہوتے تھے۔ ہاں اتنا ہے کہ آپ کی زرہ بس سامنے کے رُخ پر تھی اور پس پشت کی طرف نہ تھی رسالتمآبؐ جو تمام صفات حتیٰ شجاعت میں بھی افضل خلق

(۱) طبری۔ ج ۶ ص ۲۴۲

تھے، وہ بھی زرہ ضرور پہنتے تھے (حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ اور امیرالمومنینؑ کا ایک ظاہری اختلاف میراث نبی کے متعلق جو پیدا ہو گیا تھا اسمیں زرہ کا تذکرہ موجود ہے)

مگر کربلا میں حسینؑ کو اتنا بڑا معرکہ سر کرنا تھا۔ اتنی عظیم جنگ کرنا تھی۔ اور تاریخ میرے سامنے ہے۔ اس میں یہ ہے کہ آپ صرف ایک کرتا پہنے ہوئے تھے خز کا (خز ایک باریک کپڑا ہے جو ریشم کی طرح کا ہوتا ہے) اور سر پر عمامہ باندھے تھے (۱)

کیا جنگ کی تیاری یونہی ہوتی ہے؟ جس کو لڑنا منظور ہوتا ہے وہ یونہی میدان جنگ میں آتا ہے؟

اصحاب بھی کس کے اصحاب تھے؟ وہ بھی اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنی شائستگی میں بالکل اپنے رہنما کے قدم بقدم تھے۔ وہ بھی اسی طرح تبلیغ، اتمام حجت کے فرائض کو ادا کر رہے تھے جیسے ان کا امام۔

دنیا میں ہزاروں لڑائیاں ہوئی ہیں، ہزاروں واقعات پیش آئے ہیں، لیکن کسی رئیس، کسی سالار فوج کے ساتھی اس طرح اس کے ہر قول، ہر ہدایت، ہر دلی منشا کے مطابق عامل نہیں رہے ہیں۔

(۱) طبری۔ ج ۶ ص ۲۵۹

جس طرح حسینؑ کے ساتھ تھی۔ چنانچہ اُس موقع پر جب امام حسینؑ وہ تقریر فرما چکے جس کا تذکرہ ہم نے سابق میں کیا ہے، تو زہیر بن قین صف سے باہر نکلے۔ گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق مگر کیا جنگ کے لیے باہر آئے ہیں؟ نہیں، صرف ہدایت اور تمام حجت کے لیے۔ خطاب کیا افواج اہل کوفہ سے۔

یا اهل الکوفة نذار لکم من عذاب اللّٰہ نذار ان حقا علی المسلم نصیحة اخیه المسلم ونحن حتی الآن اخوة وعلی دین واحد وملة واحدة مالم یقع بیننا وبینکم السیف وانتم للنصیحة منا اهل فاذا وقع السیف انقطعت العصمة وکنا امة وانتم امة

"اے کوفہ کے لوگو! میں تم کو ڈراتا ہوں خدا کے عذاب سے اور تم کو اُس سے ڈرنا چاہیے۔ ایک مسلمان پر حق ہے دوسرے مسلمان کا کہ وہ اُسے نصیحت کرے۔ ہم ابھی تک آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی مذہب اسلام کے پیرو اور ایک ہی ملت نبویہ کے تابع ہیں۔ مگر اُس وقت تک کہ جب تک ہمارے تمھارے درمیان تلوار نہیں چلی ہی اور اس وقت تک تم ہماری طرف سے نصیحت کے بھی مستحق ہو۔ ہاں بے شک جس وقت شمشیر زنی کی نوبت آگئی بس اُس وقت حقوق اسلامی کی حفاظت کا سلسلہ ختم۔ اور ہم ایک امت اور تم دوسری امت ہو گئے"

ان اللہ قد ابتلانا وایاکم بذریۃ نبیہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لینظر ما نحن وانتم عاملون انا ندعوکم الی نصرھم وخذلان الطاغیۃ عبید اللہ بن زیاد فانکم لا تدرکون منھما الا بسوء عمر سلطانھما کلہ لیسملان اعینکم ویقطعان ایدیکم وارجلکم ویمثلان بکم ویرفعانکم علی جذوع النخل ویقتلان اماثلکم وقراءکم امثال حجر بن عدی واصحابہ وھانی بن عروۃ واشباھہ۔

"دیکھو خدا نے ہماری بھی آزمائش کی ہے اور تمہاری بھی اپنے نبی کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے ہمارا کیا طرز عمل ہوتا ہے اور تمہارا کیا؟ ہم تم کو دعوت دیتے ہیں ان کی مدد اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑنے کی طرف۔ دیکھو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم ان کی مدت سلطنت بھر سوائے برائی کے کوئی اچھا سلوک نہ پاؤ گے۔ وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھروا تے اور تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کرتے اور تم کو مثلہ کرتے اور تم کو سولیوں پر چڑھاتے ہیں۔ اور وہ تمہارے اچھے اچھے اشخاص اور حفاظ قرآن کو جیسے حجر بن عدی اور ان کے ساتھی اور ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کرتے رہتے ہیں۔"

کوفہ والے خوشامدی لوگوں نے ابن زیاد کی تعریف کرنا شروع کر دی

اور کہا ہم تمہارا کہنا کبھی نہیں مانیں گے، بلکہ تم کو اور اُن کو جو تمہارے امام ہیں، قتل کر کے ہی دم لیں گے۔"

زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے، اور ہدایت کرتے رہے مگر شمر بن ذی الجوشن نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش رہو۔ خدا تمہاری زبان کو خاموش کرے۔"

زہیر نے تیر کے آنے کی پرواہ نہ کی۔ نشانہ کو خالی دیا مگر سلسلہ تقریر کو قطع ہونے نہیں دیا۔ امام حسینؑ نے یہ دیکھکر کہ بات کا جواب تیر سے دیا جا رہا ہے زہیر کے لئے خطرہ کا احساس فرمایا، اور کہلوایا۔ اقبل فلعمری لئن کان مؤمن آل فرعون نصح لقومہ وابلغ فی الدعاء لقد نصحت ھؤلاء وابلغت لو نفع النصح والابلاغ۔

"بس اب واپس چلے آؤ۔ اگر مؤمن آل فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر دی تھی اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا تھا تو تم نے بھی انکی نصیحت میں کوتاہی نہیں کی لیکن نصیحت و تبلیغ سے کوئی فائدہ بھی تو ہو۔"

زہیر واپس آگئے۔ (۱)

اب تک اتمام حجت کی منزلیں تھیں۔ اب تک اصلاح کی کوششیں

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۴۔

تھیں لیکن دھوپ چڑھ چکی ہے۔ دن کا کچھ حصہ گذر چکا ہے۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا۔ درید کو آواز دی "علم اپنا قریب لا" درید علمبردار لشکر تھا۔ رایت جنگ کو قریب لایا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلّہ کمان میں جوڑا، فوج حسینی کی طرف رہا کیا اور کہنے لگا۔ اشھدوا انی اول من رمی

"گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے" (۱)

بس یہ تھا آغاز جنگ۔ رواداری کا دور ختم ہوا صلح کے مواقع باقی نہیں رہے۔ اب حسینؑ ہیں اور استقلال۔ ثابت قدمی ہے اور شیر جگری۔ حمایت باطل سے علیحدگی۔ بات پر مر مٹنا۔ اب یہ ثابت کرنا ہے کہ "ہم جان دیں گے مگر فاسق و فاجر کی بیعت نہ کریں گے۔ دنیا سے اپنی ہستی کے فنا ہونے پر راضی ہو جائیں گے، مگر اسلام کے فنا ہونے پر راضی نہ ہوں گے"

بیعت کا سوال جب ہوا حسینؑ نے یہی کہا کہ موت بیعت سے بہتر ہے

راستہ میں جب حُر کہتا ہوا جا رہا تھا "دیکھیے اپنے اوپر رحم کیجیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ قتل ہو جائیں گے" تو آپ نے فرمایا تھا۔

(افبالموت تخوفنی وھل یعدو بکم الخطب ان تقتلونی ما ادری ما اقول لک ولکن اقول کما قال اخو الاوس لابن عمہ ولقیہ

(۱) طبری، ج ۶ صہ ۲۴۵

وھو یرید نصرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال لہ این تذھب فانک مقتول فقال

سامضی وما بالموت عار علی الفتی اذا ما نوی حقا وجاھد مسلما

"کیوں حُر تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟ سب سے زیادہ جو بات تمھارے ہاتھ میں ہے وہ یہی تو کہ مجھے قتل کر ڈالو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھے کیونکر سمجھاؤں۔ لیکن میں وہ کہتا ہوں جو قبیلہ اوس کے شخص نے کہا تھا جب وہ رسالتمآبؐ کی مدد کو جارہا تھا۔ اور اُس کے بھائی نے کہا تھا "کہاں جاتا ہے تو قتل ہو جائے گا" تو اُس نے کہا "میں جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ اور موت میں کوئی ننگ و عار نہیں ہے جوانمرد کے لیے جب وہ حق پر قائم رہے۔ اور حق پر جان دے۔" (۱)

وہ تو صلح پسندی کا اظہار تھا۔ اسلام کی تعلیم کا ثابت کرنا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو وہاں تک جنگ سے علحدہ رہو۔ ورنہ حسینؑ موت سے خوف تھوڑی رکھتے تھے۔ وہ اُس باپ کے بیٹے تھے جسکا قول تھا، کہ "مجھ کو پرواہ نہیں، میں موت کی طرف جا رہا ہوں یا موت میری طرف آرہی ہے" وہ اُس باپ کے بیٹے تھے جو کہتا تھا "علیؑ کو موت سے

(۱) طبری۔ ج ۶ ص ۲۲۹

اتنی محبت ہے جتنی کسی دودھ پیتے بچہ کو اپنی ماں کی آغوش سے محبت ہوتی ہے۔"

حسینؑ نے بھی اپنے عمل سے اس کو ثابت کر دیا۔ وہ تو وہ اُن کے بچے اسی اصول پر قائم تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کے لیے حق پہ قائم رہنا ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

راستہ کا واقعہ ہے۔ جب حضرت قصر بنی مقاتل سے آگے بڑھے ہیں۔ ایک جگہ آپ کی آنکھ لگ گئی۔ چونکے تو زبان پر یہ کلمہ تھا انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین۔ شاہزادہ علی اکبر نے عرض کیا۔ "کیوں بابا کیا ہے؟" حضرت نے فرمایا۔

"میں نے خواب میں دیکھا، ایک سوار ہے جو کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ تو جا رہے ہیں اور موت ان کے عقب میں ہے۔" میں نے سمجھا کہ یہ ہمارے موت کی خبر دیتا ہے۔" شاہزادہ نے کہا یا ابت لااراک اللہ سوءًا السنا علی الحق۔ " بابا خدا آپ کو سلامت رکھے۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا بیلے والذی الیہ مرجع العباد "کیوں نہیں، بقسم اسی کی جس کی طرف تمام خلق کی بازگشت ہے۔"

شاہزادہ نے کہا یا ابت اذا لا نبالی نموت محقین۔

"بابا پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ۔ موت آئے گی تو حق پر آئیگی۔"

امام خوش ہو گئے فرمایا جزاک اللہ من ولد خیر ما جزی ولداعن والدہ۔

"خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ بہترین بدلا جو کسی فرزند کو اُسکے باپ کی طرف سے دیا جاتا ہو"(۱)

یہ تھا وہ جوہر جو آخر وقت تک آپ کے طرز عمل میں نمایاں تھا آپکے اصحاب کے طرز عمل میں نمایاں تھا۔ آپ کے اعزا کے طرز عمل میں نمایاں تھا

میدان جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے جو آرہے تھے اور وہ کوہ عزم و استقلال تھا جس سے ٹکرا کر وہ خود پاش پاش ہو جاتے تھے۔ مجھے دلدوز واقعات کا تذکرہ منظور نہیں۔ وہ ہر شخص کے دل پر لکھے ہوئے ہیں اور ہر شخص کے سامنے پیش نظر ہیں۔

گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں۔ ان سخت سے سخت تکالیف میں حسینؑ کی زبان تھی اور اُس پر یہ کلمہ جاری تھا۔

ان کان دین محمد لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی

"اگر میرے نانا کا مذہب اُس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری رگ حیات قطع اور میری زندگی ختم نہ ہو جائے تو لے

(۱) طبری، ج ۶ ص ~~۲۳۱~~ ۔ ۲۳۲

خوں آشام تلوارو! آؤ یہ جسم تمھارے لیے موجود ہے۔ اسے لے لو!!"

واقعات سخت سے سخت ہوتے جاتے تھے۔ اصحاب برابر نصرت کرتے رہے۔ امام کی حمایت کا جو حق تھا ادا کر دیا۔ دنیا میں ایسے ثبات قدم کا نمونہ، اور ایسے استقلال کا مظاہرہ آج تک نہیں ہوا ہے۔ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تیس ہزار آدمی ایک طرف اور بہتر آدمی ایک طرف۔ اور اس پر جس ثبات و استقلال کے ساتھ انھوں نے جنگ کی ہے جس طرح اطمینان قلب کے ساتھ۔ خوش خوش چہروں کے ساتھ۔ بشاش بشروں کے ساتھ قائم رہے۔ اسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی"

انھیں یہ احساس تھا کہ ہم زخم نہیں کھا رہے ہیں بلکہ ہم خود زندہ ہو رہے ہیں، اور مذہب کو زندہ کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ خوش تھے انھیں کوئی اضطراب نہ تھا۔

امام حسینؑ خیمہ کے اندر ہیں اور عبدالرحمٰن ابن عبد ربہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی دروازہ پر بیٹھے ہیں۔ اور بریر عبدالرحمٰن کیساتھ کچھ مذاق کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بگڑ کر کہتے ہیں۔ دعنا فواللہ ماھذہ نسبا عتباطل" چپ رہو! یہ گھڑی ایسی باتوں کی نہیں ہے" چونکہ مذاق عام طور پر حقیقت سے الگ ہوتا ہے۔ اس لیے اُسے عام محاورہ

میں "باطل" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) بریر نے کہا۔

"خدا کی قسم میرے قبیلہ کے تمام آدمی جانتے ہیں کہ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کبھی میری طبیعت میں مذاق نہیں رہا۔ مگر عبدالرحمٰن! اس وقت سے بڑھ کر اور کون وقت خوشی کا ہوگا۔ بس ایک تھوڑی دیر تک دو دو ہاتھ دشمن سے جنگ کرنا ہے، اور پھر جنت میں پہنچ جانا ہے۔ مجھے تو جتنی دیر ہوتی ہے وہ طبیعت پر گراں ہے، اور دل چاہتا ہے کہ کہیں جلدی سے دشمن کی تلواریں ہم پر برس پڑیں اور ہمارا کام تمام کر دیں۔" (۱)

کیا کہنا ان اصحاب کی شجاعت کا، کیا کہنا ان کی پر جگری کا۔

عابس بن ابی شبیب شاکری میدان جنگ میں آتے ہیں۔

"الا رجل" "الا رجل"۔ "کیا کوئی مرد نہیں ہے جو میرے مقابلہ کو نکلے۔"

لشکر عمر سعد پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ آوازیں بلند ہوتی ہیں

ھذا اسد الاسود ھذا ابن ابی شبیب لا یخرجن الیہ احد منکم۔ "یہ شیروں کا شیر۔ یہ عابس بن ابی شبیب ہے۔ جو اس کے مقابلہ کو جائے گا جان سلامت واپس نہ لائے گا۔"

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۱

عمر سعد کا حکم ہوتا ہے "پتھروں کی بارش کر دو" کیا کہنا اس اصول
جنگ کا۔ بہادروں کا مقابلہ اس صورت سے کرنا عرب کی بہادری
کے لئے ننگ رہے گا۔

ہر طرف سے پتھروں کا مینھ برسا۔ عابس نے زرہ اُتار کر پھینک دی
مغفر اُتار کر پھینک دیا۔ اور اسی طرح دشمن کی فوج میں ڈوب گئے۔

یہ ہے شجاعت۔ اس کا نام ہے جاں نثاری۔ وہ اپنی اس محدود
زندگی کو زندگی ہی نہ سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم کو ایک لامحدود زندگی
حاصل کرنا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس زندگی کو جلد حاصل کر لیں۔

ایک وہ وقت آیا کہ اصحاب میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ اعزا بھی
شہید ہو چکے۔ کوئی نہیں حسینؑ ہیں اور دشمن کا لشکر۔ چاروں طرف
سے ہجوم ہے۔ حملوں پر حملے ہیں۔

بے شک حسینؑ ہیں اور ثبات قدم۔ استقلال ہے اور پامردی
بات پر قائم رہنا ہے اور حمایت حق۔ باطل سے علیحدگی ہے اور نصرت مذہب۔
اب جنگ کو دیر گذر چکی ہے۔ واقعات سخت تر ہوتے جاتے ہیں
مصائب کا تذکرہ مجھے منظور نہیں۔ وہ آپ سنا ہی کرتے ہیں۔ مجھے
وہی چیزیں بیان کرنا ہیں جن کا میرے موضوع بیان سے تعلق ہے۔
فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ واللہ ما رأیت

مکسورا قط قد قتل ولدہ واھل بیتہ واصحابہ اربط جاشا ولا امضیٰ جنانا منہ ولا اجرأ مقدما واللہ ما رأیت قبلہ ولا بعدہ مثلہ۔

"خدا کی قسم۔ میں نے کوئی دل شکستہ و زخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد۔ بھائی۔ اعزا۔ انصار۔ سب قتل ہو گئے ہوں ایسا نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن۔ مستقل مزاج۔ ثابت قدم اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم اُن سے زیادہ کیا میں نے اُن کے قبل اور اُن کے بعد اُن کے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا"(۱)

اس عزم و استقلال کے ساتھ دنیا کو یہ سبق دے رہے تھے کہ دیکھو حق پر اگر ہو تو جان دینے میں مضائقہ نہ کرو۔ ہر چیز کے مقابلہ میں جان عزیز سمجھو مگر عزت۔ مذہب اور ناموس دین۔ ایسی چیز نہیں ہے جسکے مقابلہ میں جان عزیز کیجائے۔

آپ کا نعرۂ شیرانہ ہے جو کربلا کی فضا میں آپ کے دہن سے نکل کر گونجا اور پھر فنا نہیں ہو گیا۔ وہ مردہ قوموں میں حیات پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ ایک جملہ ہے جو کربلا میں آپ کی زبان پر تھا۔ الموت اولیٰ من رکوب العار "موت عار و ننگ کے برداشت

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۵۹

کرنے سے بہتر ہے"! یہ وہ کلمہ ہے جو حیات قومی کا سرنامہ قرار پانے کے قابل ہے۔ (۱)

حسینؑ نے حق کے لیے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔ اصحاب کو اپنے سامنے رخصت کیا۔ اولاد کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا۔

ہوسکتا تھا کہ حسینؑ سب سے پہلے ہی لڑتے اور شہید ہوجاتے یہ اور بات ہے کہ اصحاب آپ کو روک سکتے اور گوارا نہ کرتے۔ مگر یہ بھی تو کہیں تاریخ میں نہیں ہے کہ آپ نے چاہا ہو۔ پہلے خود شہید ہوجائیں پہلے خود ہی دشمنوں کے تیغ و نیزہ و خنجر کا نشانہ قرار پائیں۔

آپ نے یہ نہیں چاہا۔ سب کو اجازت دیدی۔ عزیز سے عزیز جگر کے ٹکڑوں کو خوشی خوشی اجازت دی۔

بات کیا تھی؟ حسینؑ چاہتے تھے کہ جو کچھ بھی مجھ سے تعلق رکھتا ہے جو کچھ میری طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ جو کچھ میرے خزانہ میں ہے، اس کو اپنے ہاتھ سے لٹا دوں۔ سب کو اسلام پر نثار کردوں۔ جب کچھ نہ رہے تو اپنی جان دیدینا تو آسان ہے یہ مرحلہ ختم ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔

نفس کی کمزوری ہوتی اگر آپ اپنی زندگی ختم کرنے پر پہلے ہی

(۱) یہ اور اس کے بعد کا مضمون تفصیل سے رسالہ حسین اور اسلام میں درج ہے۔

تیار ہو جاتے۔ نہیں، یہ تحمل تھا۔ یہ قوت برداشت تھی۔ یہ صبر تھا، کہ چاہتے تھے سب کو میں اپنے ہاتھ سے نثار کر دوں۔ ساتھیوں کی مفارقت برداشت کروں۔ عزیزوں کی جدائی کا تحمل کروں۔ بھائی بیٹے اور اولاد سب کو اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں دوں۔

سب کے متعلق تو میں مجازاً کہتا ہوں کہ حضرتؑ نے اپنے ہاتھ سے اسلام پر فدا کیا، مگر وہ شہید جو خود میدان جنگ میں آنے کے قابل نہ تھا اُسے حقیقۃً اپنے ہاتھ سے لا کر فدیۂ اسلام کیا۔

جب سب کو اسلام کی نصرت میں نثار کر دیا تو اس کے بعد اپنی نوبت آئی۔ اپنے اعضا و جوارح تیغ و خنجر کے حوالہ کیے۔ اپنا خون اسلام کی نذر کیا۔ جسم کے تمام حصّے اس طرح نصرت دین میں صرف کیے کہ ایک ایک زخم پر کئی کئی زخم پڑ گئے۔

جب کچھ نہ باقی رہا تو اُس وقت روح و بدن کا اتصال۔ وہ آخری علاقہ جس پر نفس کی آمد و شد کا انحصار، زندگی کا دار و مدار ہے۔ اپنا سر بھی راہ خدا میں پیش کر دیا۔

حسینؑ اپنی قربانی کے تمام مراتب منظّم صورت سے انجام دے رہے تھے۔ اگر یہ پہلا ہی مرحلہ ابتدائی منزل میں قطع کر دیتے۔ کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دیدی۔ لیکن آپ نے آہستہ آہستہ

قربانی کے منازل کو طے کیا۔ تاکہ یہ گھٹنے کو نہ ہو۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ عقل و تدبر پر مبنی اور کامل صبر و سکون کے ساتھ مکمل نظم و ترتیب کا نتیجہ ہے۔

مذکورۂ بالا واقعات کا نتیجہ

یا

اس سبق کا خلاصہ

موجودہ زمانہ میں اگر قومی حالت پر نظر کیجائے۔ اگر افراد کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑی قوم کی کمزوری اور ایک بہت بڑا مرض یہ ہے کہ قومیت کا صحیح احساس نہیں، غیروں کے ساتھ تو درکنار اپنوں کے ساتھ بھی رواداری کے جذبات فنا ہو گئے ہیں یہ افتراق۔ یہ اختلاف، روزمرّہ کی لڑائیاں۔ روزمرّہ کے تنازعات جن سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ کاہے کا نتیجہ ہیں؟ یہ صرف رواداری نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک اپنے اغراض و مفاد کے سامنے دوسرے کے اغراض کو پامال کر دینے کے لیئے تیار۔ اپنے مطلب کے لیے ہر ایک کو نقصان پہنچانے پر آمادہ۔ یہ خودغرضی۔

یہ مطلب پروری جس سے افراد کے درمیان محبت کے جذبات کمزور
اور قومیت کا شیرازہ روز بروز زیادہ منتشر ہوتا جاتا ہے۔

اس کے بعد جوش عمل باقی نہیں رہا۔ ایک طرف رواداری مفقود
دوسری طرف جوش عمل مفقود۔ رواداری نہیں اس لیے لڑیں گے
دوسرے کی ترقی و بہبودی میں روڑے اٹکائیں گے۔ خود جوش عمل
نہیں اس لیے اپنی ترقی و بہبودی کا کوئی سامان نہ کریں گے۔ کاش
جوش عمل کے کمزوری کے پردہ ہی میں رواداری پیدا ہوئی ہوتی۔
لیکن ایسا بھی نہیں۔ اس لیے نہ کوئی انفرادی ترقی حاصل ہوتی
ہے نہ اجتماعی۔ انفرادی اس لیے نہیں کہ وہ قوت عمل پر موقوف ہی
اور اجتماعی اس لیے نہیں کہ وہ شیرازہ قومی کے اجتماع پر مبنی ہے
جو رواداری پر موقوف۔ آئین پسندی، جس بات کو حق سمجھ لینا اُس پر مرمٹنا،
یہ چیزیں وہ ہیں جو ارتقائے قومی کا حقیقی رمز ہیں۔ مگر جوش اور قوت عمل کے کمزور
ہونے سے یہ جوہر بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ ثابت قدمی باقی نہیں رہتی۔ استقامت
کا وجود نہیں رہتا۔ استقلال کا پتہ نہیں ملتا۔ دعاوی رہتے ہیں جن کا ثبوت
مفقود ہو جاتا ہے۔ اگر واقعہ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کر لے۔ اگر حقیقۃً
سید الشہداؑ نے کربلا میں جو اسوۂ حسنہ پیش کیا اُس کو اتنا سمجھ لے کہ اُس پر
عمل پیرا ہو سکے تو قوم میں زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ قوم میں تمام وہ خصوصیات

پیدا ہوجائیں جو ایک قوم کے حقیقی ارتقار کا جزو اعظم ہیں۔

چوتھا سبق

بات کی صفائی

اور

حقیقت کا اعلان

دنیا کے سیاست اندیش اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں اور کسی چیز کے محرک تو وہ اُن لوگوں کو جنھیں ساتھ لینا چاہتے ہیں طرح طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند توقعات پیدا کرکے اُن کے خواہشات کو جذب کرتے اور انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فتح و ظفر کی کہانیاں سُنائی جاتی ہیں۔ مال و دولت۔ جاہ و ثروت کے خواب دکھلائے جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے ساتھ لوگوں کو فراہم کیا جاتا اور اُن کی ہمتیں بڑھائی جاتی ہیں۔

اپنی کمزوریاں، مایوسیاں، نا امیدیاں، اُن اشخاص سے مخفی رکھی جاتی ہیں کہ جن سے کام لینا منظور ہے۔ جو جا بکیم یہ کہنا کہ تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو۔ تم

ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری وجہ سے اپنی جان دو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی سچائی اور انسان کی ایمانداری و دیانتداری پوری طرح حرف آتا ہے اس امر سے کہ وہ کسی کو دھوکے میں مبتلا رکھے اور ایک سچے داعی مذہب اور حقیقی رہنما کے لیے ننگ و عار ہے کہ وہ دوسروں کو غلط توقعات قائم کر کے اپنے ساتھ شریک کرے۔ یا کم از کم خاموش رہ کر انکو عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے۔

امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے ساتھ غلط فہمی سے مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بنا پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو صرف آخری وقت میں نہیں بلکہ شروع سے! اس وقت جبکہ ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کی دنیاوی کامیابی کی توقع بہت قوی ہو سکتی تھی، اسی وقت سے آپ نے اس امر کی کوشش کی کہ کسی کو غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ اور ان ظاہری اسباب سے جو توقعات پیدا ہوتے ہیں اُن پر بھروسہ کر کے کوئی ہمارے ساتھ نہ آئے۔ اس لیے آپ برابر حقیقت حال سے اور اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے۔ اور اعلان فرماتے رہے کہ ہمارا آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اُس وقت جب آپ ابھی مدینہ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے۔ اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوئے تھے اور خاص اعزا کی جماعت آپ کے ساتھ چلنے کے

اوپر آمادہ تھی۔ اُس وقت آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابو سعید مقبری (جو رجب سنہ ۶۰ھ میں جب امام حسینؓ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے ہیں وہاں موجود تھے) ناقل ہیں کہ میں نے امام حسینؓ کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لیے جا رہے ہیں اور دو دو آدمی دونوں طرف سے آپ کے بازو تھامے ہوئے ہیں اور آپ ابن مفرغ شاعر کے اس قول کو بطور تمثیل پڑھ رہے ہیں

لاذعرت السوام فی فلق الصبح مغیرا ولا دعیت یزیدا

یوم اعطی من المھابۃ ضیما والمنایا یرصدننی ان احیدا

شاعر نے اپنا نام نظم کیا ہے، لیکن آپ کی زبان سے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "میرا نام حسینؓ نہیں اگر موت کے خوف سے میں ذلت کو برداشت کروں اور اُس وقت کہ جب موت میری تاک میں ہے میں ہٹ جاؤں"۔

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا، مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور وہ بیان کرتا ہے کہ فقلت فی نفسی واللہ ماتمثل بھذین البیتین الا لشیٔ یرید۔

"ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا کی قسم ان شعروں کا پڑھنا رمز سے خالی نہیں ہے، ورکوئی مقصد آپ کے پیش نظر ہے جبھی یہ شعر اسوقت پڑھ رہے ہیں"۔

اس کے بعد دو دن نہ گذرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے (۱)

اب وہ وقت آیا کہ آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہونے والے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آیند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں۔ اس لیے کہ کوفہ عراق کا پایہ تخت اور بڑا مرکز ہے۔ امیر المومنینؑ کا دار السلطنت رہ چکا ہے۔ اور لوگوں کی نظر میں علیؑ اور اولاد علیؑ کے دوستوں سے پُر ہے۔ وہاں سے بارہ سو نامے آچکے ہیں کہ آپ آیئے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لیے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلمؑ روانہ کیے جا چکے ہیں۔ ان کا خط آچکا ہے کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے۔ ان سب باتوں کے بعد امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس سفر کے متعلق کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کیے جائیں گے، اس لیے قدرۃً آپ کے ساتھ بہت سے لوگوں کو اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں جا کر آپ کی سلطنت سے فائدہ اٹھائیں اور نیز چونکہ آپ ایک زرخیز زمین پر جا رہے ہیں، اس لیے وہاں جا کر مالی منافع بھی حاصل کریں۔

اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لیجاتے تو ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوتی آپ کے ساتھ ہوتی اور یقیناً شروع شروع تو اگر جنگ

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۱

کا موقع ہوتا وہ فتح کے توقعات میں آپ کے ساتھ جنگ میں بھی شریک ہوتی۔
لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے
حقیقت کو واضح فرمادیں اور سب کو بتلادیں کہ اُن کے خوش آیند توقعات
سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن
قبل عام مجمع میں تقریر فرمائی جس میں بعد حمد و صلوٰۃ کے حسب ذیل الفاظ ارشاد
کیے تھے۔

خط الموت علی ولد آدم مخط القلادۃ علی جید الفتاۃ وما اولھنی الی
اسلافی اشتیاق یعقوب الی یوسف وخیرلی مصرع انا لاقیہ کانی
انظر باوصالی تقطعھا عسلان الفلوات بین النواویس وکربلاء فیملأن
منی اکراشا جوفا واجربۃ سغبا لا محیص عن یوم خط بالقلم رضا
اللہ رضانا اھل البیت نصبر علی بلائہ توفینا اجر الصابرین لن تشذ
عن رسول اللہ لحمتہ، بل ھی مجموعۃ لہ فی حظیرۃ القدس تقربھم
عینہ وینجز بھم وعدہ من کان باذلا فینا مھجتہ وموطنا علی لقاء
اللہ نفسہ فلیرحل معنا فانی راحل مصبحا انشاء اللہ۔

موت اولادِ آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں کتنا اپنے اسلاف کی ملاقات،
کا مشتاق ہوں ہر اتنا جتنا یعقوب یوسف کی ملاقات کے مشتاق تھے۔
میرے لیے بہتر ہے بہتر وہ جگہ ہوگی جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں۔

وہ خبریں تھیں جو سینہ بسینہ رسولؐ سے پہونچی تھیں، جن کی بنیاد پر آپ اپنے مستقبل کی خبر دے رہے تھے) میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے بمقام نواویس اور کربلا کے درمیان میں وہ مجھ سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے۔ کوئی چارہ کار نہیں ہے، کوئی مفر نہیں ہے اس دن سے جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو اسی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسالتمآب سے ان کے جگر کے ٹکڑے دور نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ وہ بارگاہ قدس میں جنت اعلیٰ میں ان کے پاس مجتمع ہونے والے ہیں جس سے ان کی آنکھیں خنک ہوں گی، ان کا وعدہ پورا ہوگا، جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤنگا۔"

دیکھیے ان الفاظ کے ساتھ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیجا رہی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہوگا؟ کیا اس سے بڑھ کر صاف کوئی طہارت ضمیر کا مظاہرہ ہوگا؟

اب ساتھ چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے کے اوپر تیار تھے۔ جو حقیقۃً استقلال اور ثابت قدمی رکھتے تھے، جن کو دنیا کی کوئی توقع اور

راحت دنیا کا کوئی خیال اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ حقیقت کے طالب تھے، اور مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا کے مال و دولت، جاہ و حشم کو خاک سیاہ سمجھتے تھے۔ جو زندگی کے طالب تھے اور اُسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے بس وہی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ منتخب مجمع چھٹے ہوئے لوگ، یہ طریقہ تھا امام کے انتخاب کا۔ اور اس طرح آپ نے چاہا تھا کہ حشو و زوائد آپ کے ساتھ نہ ہونے پائیں، وہی آئیں جو موت کے والہ و شیفتہ ہوں۔

یہ تقریر مکہ معظمہ کی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کر دیا اور حقیقت حال واضح کر دی۔ مگر مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستہ کے اعراب، بادیہ نشین قبائل، بے خبر اشخاص، خالی الذہن افراد امام کو دیکھتے ہیں کہ ایک جمعیت کے ساتھ ایک بڑے قافلہ کی شان سے جا رہے ہیں، دریافت کرتے ہیں "کہاں جا رہے ہیں" معلوم ہوتا ہے "عراق۔ وہاں سے طلبی ہوئی ہے"۔ لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ آنے والی جماعت مختصر تھی مگر راستہ میں طرح طرح کے لوگ شریک ہونے لگے اور وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی حیثیت رکھتی تھی اب ایک لشکر کی صورت میں آ گئی۔ کوئی اور ہوتا

تو اس فوج کو غنیمت سمجھتا، اس لشکر کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین موقع خیال کرتا، وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں اپنے ساتھ گرویدہ رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے ابھی تک امام حسین علیہ السّلام بھی خاموش تھے۔ مجمع بڑھتا جاتا تھا۔ ہر منزل پر کچھ نہ کچھ نئے لوگ آکر شریک ہوتے تھے یہاں تک کہ جب عراق کے حدود میں پہونچے اور منزل زرود پر قافلہ پہونچا عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشمعل اسدی نے جو مکہ معظمہ سے آکر قافلہ سے ملحق ہوئے تھے ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امامؑ کی بھی نظر اس پر پڑی اور ٹھہر کر یہ چاہا کہ کچھ حالات کوفہ کے اس سے دریافت کریں۔ لیکن اس نے یہ دیکھکر راستہ بدل دیا اور دوسری طرف روانہ ہوا۔ امامؑ اسکے بعد آگے بڑھ گئے، مگر عبداللہ اور منذر نے قافلہ سے الگ ہو کر اس شخص سے ملاقات کی اور اس سے کوفہ کے حالات دریافت کئے۔ اس نے بیان کیا کہ میں کوفہ سے اس وقت چلا ہوں جب مسلم ابن عقیل اور ہانی ابن عروہ قتل ہو چکے تھے۔ یہ دونوں آدمی حالات معلوم کر کے واپس آئے۔ شام کا وقت تھا۔ رات بھر انھوں نے یہ بات دل میں رکھی۔ صبح کو جب امامؑ اپنے مخصوص احباب کے مجمع میں تشریف فرما تھے تو دونوں آدمی حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا "ہمیں کچھ عرض کرنا ہے" ارشاد ہو تو ان لوگوں کے سامنے عرض کریں اور اگر حکم ہو تو علیحدہ"۔ حضرت نے ایک نظر ان اصحاب پر ڈالی

جو اس وقت موجود تھے اور فرمایا "ما دون هولاء سر" ان لوگوں سے راز کی بات کیا ہوگی" دونوں شخصوں نے عرض کیا، "آپ نے اس سوار کو ملاحظہ فرمایا تھا جو کل شام کو کوفہ کی طرف سے آرہا تھا؟ حضرت نے فرمایا "ہاں اور میں نے چاہا بھی تھا کہ اس سے کچھ حالات دریافت کروں" انھوں نے عرض کیا ہم نے حضور کا منشا پورا کردیا وہ ہمارے ہی قبیلہ کا ایک شخص ہے۔ قابل اطمینان اور معتبر، اس نے یہ بیان کیا کہ مسلم ابن عقیل اور ہانی ابن عروہ شہید ہو گئے اور ان کی لاشیں بازار میں پھرائی گئیں۔ امام علیہ السلام نے یہ سنکر بس چند مرتبہ (انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہما) کا کلمہ زبان پر جاری فرمایا اور خاموش ہو گئے۔

یہ دونوں آدمی جو شب بھر اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھکر اس سے کافی اثر لے چکے تھے اور تمام صورت حال پر غور کر چکے تھے کہ کوفہ جانا اب بیکار ہے اور کوئی امید کوفہ میں باقی نہیں ہے۔ انھوں نے بیتاب ہو کر کہا ننشدک اللہ فی نفسک واهل بیتک الا انصرفت من مکانک هذا فانہ لیس لک بالکوفۃ ناصر ولا شیعۃ بل نتخوف ان تکون علیک۔

"ہم حضور کو خدا کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ بس یہیں سے واپس چلیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ دوست بلکہ ہمیں اندیشہ ہے

کہ کوئی ناگوار صورت پیش نہ آئے۔

حضرت نے مناسب وقت جواب دے کر ان لوگوں کی تسلی کر دی اور پھر خاموشی اختیار فرمالی۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقۃً جیسا امام نے مجمع کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "ان لوگوں سے کوئی راز کی بات راز نہیں ہے" تو وہ جماعت تھی ہی ایسی رازدار و مانند ارکہ ایسی عظیم خبر کی اطلاع ہوئی اور اس مجمع میں بیان کیگئی مگر پھر بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی صورت میں رہی اور کسی شخص کو اس کی اطلاع نہ ہوئی اور نہ کوئی انتشار پیدا ہوا نہ اضطراب۔

عبداللہ بن یقطر جو حضرتؑ کے رضاعی بھائی تھے اور آپ نے ان کو راستہ سے روانہ فرمایا تھا، ان کی شہادت کی بھی خبر آگئی اور حضرت نے سن لی۔ عام قافلہ والے اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوفہ کی فضا امام کے موافق ہے لیکن امام لوگوں کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانا کب منظور کر سکتے ہیں۔ آپ نے چاہا کہ حقیقت حال واضح ہو جائے۔ چنانچہ جب آپ منزل زبالہ پر پہونچے تو آپ نے قیام فرمایا، اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے، آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں سب کو پڑھکر سنائی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امّا بعد، فقد اتانا خبر فظیع قتل مسلم بن عقیل وھانی بن عروۃ وعبداللہ بن یقطر وقد خذلنا شیعتنا

فمن احب منکم الانصراف فلینصرف فلیس علیہ منا ذمام۔

"ہمارے پاس ایک دردناک خبر پہونچی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے۔ اور وہ لوگ جو ہماری دوستی کا دعویٰ کرتے تھے انھوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورت حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اُس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہے۔"

یہ حضرت کی تقریر تھی جس کے بعد تفرق الناس عنہ تفرقا فاخذوا یمینا وشمالا حتی بقی فی اصحابہ الذین جآء وامعہ من المدینۃ۔

"لوگ متفرق ہونے لگے اور کوئی داہنی طرف کوئی بائیں طرف اُٹھ اُٹھ کے جانے لگا۔ یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی"۔ اس طرح سے مجمع چھٹ گیا اور صرف وہی لوگ رہ گئے جو آپ کی مکہ معظمہ والی تقریر کو سن چکے تھے اور حقیقۃً موت پر آمادہ تھے۔

مورخ کا بیان ہے "آپ نے یہ صورت اس لیے اختیار کی کہ آپ کو خیال تھا کہ عام عرب راستہ سے آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں اس گمان پر کہ آپ ایسے شہر جا رہے ہیں جہاں کے لوگ پورے طور سے آپ کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ جہاں کی زمین پورے طور سے ہموار ہو چکی ہے۔ آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔ آپ نے چاہا کہ صرف وہی لوگ آپ کے ساتھ رہ جائیں

جو حقیقت حال سے مطلع ہوں، اور سمجھ چکے ہوں کہ صورت حال کیا ہے۔ آپ کو یقین تھا کہ آپ کے اس اعلان کے بعد بس وہی لوگ رہ جائیں گے جو آپ کے سچے ہمدرد اور آپ کے ساتھ جان دینے پر تیار ہیں" (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)

راستہ کی منزلیں ختم ہوئیں اور اب وہ وقت ہے کہ حضرت کربلا پہونچ چکے صلح کی گفتگو ختم ہو چکی اور دشمن نے حملہ بھی کر دیا۔ صرف ایک رات کی مہلت ملی ہے اور وہ بھی بشکل عبادت خدا کے لیے۔ مگر امام حسینؑ اب بھی اتمام حجت کرتے ہیں۔ ساتھیوں کو ایک آخری موقع دیتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اب جو لوگ تھے وہ منتخب۔ وہ حقیقۃً موت پر تیار مگر حضرتؑ نے چاہا کہ ان کا بھی امتحان ہو جائے اور اُن کے ثبات قدم کا بہترین مظاہرہ سامنے آجائے۔

چنانچہ امام زین العابدینؑ کی روایت ہے کہ جب عمر بن سعد سے ایک شب کی مہلت مل گئی اور عمر سعد کی فوج واپس گئی تو حضرتؑ نے اپنے اصحاب کو جمع فرمایا،

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا مگر ذرا قریب پہونچا کہ سنوں، حضرتؑ کیا فرماتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ (اثنی علی اللّٰہ تبارک وتعالیٰ احسن الثناء واحمدہ علی السراء والضراء۔ میں خدا کی بہترین ثنا کا فرض ادا کرتا اور سختی ہو یا آسانی ہر حال میں اس کا شکر کرتا ہوں"۔ اللّٰھم انی احمدک علی ان اکرمتنا بالنبوۃ وعلمتنا القرآن وفقھتنا فی الدین

وجعلت لنا اسماعا و ابصارا و افئدۃ و لم تجعلنا من المشرکین

"خداوندا میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے نبوت عطا کر کے ہماری عزت بڑھائی اور قرآن کی تعلیم ہم کو عطا کی اور دین میں ہم کو فقیہ قرار دیا۔ ہم کو تو نے گوش شنوا اور چشم بینا اور قلب دانا عطا فرمائے، اور ہم کو تو نے جماعت مشرکین سے نہیں قرار دیا۔"

اما بعد فانی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی و لا اھل بیت ابر و لا اوصل من اھل بیتی فجزاکم اللہ عنی جمیعًا خیرا۔ (اب حضرت اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور فرماتے ہیں) مجھے علم نہیں ہے کہ دنیا میں کسی کے اصحاب میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اور ان سے بہتر ہوں (اصحاب کا ذکر پہلے کر دیا اس لیے کہ غیروں کا معاملہ تھا مگر خیال ہوا کہ عزیزوں کی دلشکنی نہ ہو اس لیے اصحاب کے بعد عزیزوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوا) اور نہ مجھے کسی کے اعزا (خاندان والے) معلوم ہیں جو میرے عزیزوں سے زیادہ حق شناس و مطیع و فرمانبردار ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے نیک بدلا دے، جزائے خیر عطا فرمائے۔

الا و انی اظن یومنا من ھؤلاء الاعداء غدا الا و انی قد رأیت لکم فانطلقوا جمیعا فی حل لیس علیکم منی ذمام ھذا اللیل قد غشیکم فاتخذوہ جملا۔

"آگاہ ہو کہ میرے خیال میں کل کا دن ہمارا ان اعداء کے ساتھ تاریخی دن ہوگا۔ میں نے تمھارے متعلق غور کیا ہے اور میری رائے تمھارے لیے یہ ہی کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ، اور میری اجازت ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔ کوئی تمھارے اوپر میری طرف سے ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ دیکھو یہ رات کا پردہ پڑ گیا ہے۔ اسے تم اپنے لیے غنیمت سمجھو، اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

عزیزوں سے خود نہیں کہا کہ تم چلے جاؤ مگر اس لیے کہ اصحاب کو برا نہ معلوم ہو، اصحاب سے یہ فرمایا کہ لیاخذ کلّ رجل منکم بید رجل من اھل بیتی ثمّ تفرقوا فی سوادکم ومدائنکم حتّی یفرج اللّٰہ فانّ القوم انّما یطلبونی ولو قد اصابونی لھوا عن طلب غیری۔

"تم خود جاؤ اور اتنا اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے ایک ایک میرے عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اُسے اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اسکے بعد اپنے اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق ہو جاؤ، تاوقتیکہ تمھیں کشائش اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل ہو اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں۔ اگر میں انھیں ملجاؤں اور مجھکو قتل کر ڈالیں تو پھر انھیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی"۔

بس یہ اتمام حجت تھی لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس کا کوئی فرد حقیقت حال سے بے خبر ہو کر ساتھ نہیں آیا تھا۔ کوئی لالچ اور طمع دنیوی پیش نظر رکھکر شریک نہیں ہوا تھا اس لیے ایک طرف اعزا کھڑے ہو گئے۔

بھائی، بیٹے، بھتیجے اور عبداللہ بن جعفرؓ کی اولاد اور سب نے کہا۔ جن میں سب سے پہلے بولنے والے حضرت عباس بن علیؑ تھے کہ لم نفعل لنبقی بعدک لا ارانا اللہ ذالک ابدا "یہ کیوں؟ کس لیے؟ کس واسطے ہم واپس چلے جائیں؟ اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہم کو یہ روز بدنصیب نہ کرے"۔

حضرت متوجہ ہوئے اولاد عقیل کی طرف اور فرمایا "تمھارے لیے مسلم کا قتل ہونا کیا کم ہے؟ تم تو چلے جاؤ، تم کو میں نے اجازت دیدی"۔ انھوں نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہم بھی اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کریں گے"۔

اصحاب بظاہر اعزا کے احترام کی وجہ سے خاموش تھے جب اعزا اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو وہی اسّی برس کا ضعیف العمر جاں نثار مسلم بن عوسجہ مجمع کے درمیان سے کھڑا ہوا۔ انصار حسینؑ میں ان سے زیادہ سن کوئی نہ تھا۔ پشت خمیدہ اور جسم کمزور تھا مگر دیکھنے کی بات ہے کہ کہیں الفاظ سے دل کی کمزوری تو نمایاں نہیں ہے؟ عرض کرتے ہیں۔

انحن نخلی عنک ولما نعذر الی اللہ فی اداء حقک اما واللہ اطعنہم حتی اکسر فی صدورہم رمحی واضربہم بسیفی ما ثبت قائمہ فی یدی ولا افارقک ولو لم یکن معی سلاح اقاتلہم بہ لقذفتہم بالحجارۃ دونک حتی اموت معک۔

"ہم آپ کو چھوڑ دیں؟؟؟ اس صورت میں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ خدا کی قسم میں ان دشمنوں کو اتنے تیر لگاؤں گا کہ اُن کے سینوں میں میرا نیزہ ٹوٹ جائے اور اُس وقت تک شمشیر زنی کروں گا جب تک اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں رہے۔ میں آپ سے کسی وقت جدا نہ ہوں گا۔ اور اگر ہتھیار میرے پاس نہ ہوں گے اور بیکار ہو جائیں گے تب بھی پتھروں سے ان سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی نصرت میں کام آؤں۔ اور آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کروں"

مسلم بن عوسجہ جو کہنا تھا وہ کہکر بیٹھ گئے۔ تب اُن سے کم عمر کے جو لوگ تھے اُن کو جرأت ہوئی کچھ کہنے کی۔ یہ ادب تھا۔ یہ اخلاقی تربیت تھی۔ یہ شائستگی تھی جس طرح بنی ہاشم سے پہلے اصحاب نے کچھ نہیں کہا، اُسی طرح اصحاب میں کسی نوعمر آدمی کو اُس وقت تک جرأت نہیں ہوئی جب تک مسلم اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر چکے۔

اب سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے انھوں نے کہا۔ واللہ لا نخلیک حتیٰ یعلم اللہ انا قد حفظنا غیبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلّم فیک واللہ لو علمت انی اقتل ثمّ احیا ثمّ احرق حیا ثمّ اذرّا یفعل ذلک بی سبعین مرّۃ ما فارقتک حتی القی حمامی دونک فکیف لا افعل ذلک وانما ھی قتلۃ واحدۃ ثمّ ھی الکرامۃ التی لا انقضاء لھا ابدا۔

"خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے جب تک ثابت نہ کر دیں کہ ہمنے

جنابِ سیّدہ خدا کی وصیت کو جو آپ کے بارے میں تھی پورا کر دیا. خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا پھر جیتے جی آگ میں جلایا جاؤں گا. پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی. ایسا ہی میرے ساتھ ستر مرتبہ سلوک ہو گا تب بھی آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک کہ آخری موت آپ ہی کے قدموں پر نہ آئے۔ چہ جائیکہ اب میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گا؟ حالانکہ جانتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ قتل ہونا ہے۔ اور اس کے بعد زندگی ہی زندگی اور عزت دائمی ہے"۔

اس کے بعد زہیر بن القین کھڑے ہوئے۔ یہ وہی پرجوش جاں نثار ہیں جنہوں نے حُر کے معاملہ میں ہی کہا تھا کہ ہمیں ان سے لڑ لینے دیجیے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کہا (معلوم ہوتا ہے دلوں میں وہ تلاطم ہے کہ الفاظ تلاش کرتے ہیں مگر مطلب ادا کرنے کو ملتے نہیں)

"خدا کی قسم میری تو یہ آرزو ہے کہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ یونہی ہزار مرتبہ میرے ساتھ سلوک ہو۔ لیکن کسی طرح آپ کی اور آپ کے اعزا و اقارب ان ہاشمی جوانوں کی جان بچ جائے جو آپ کے ساتھ ہیں"۔

دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں، اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب نے متفق اللہجہ یہ کہا کہ "ہم آپ سے جدا نہیں ہوں گے بلکہ اپنی جان آپ پر فدا کریں گے۔ اپنے سینے، سر، بازو، تمام اعضاء و جوارح آپ کی نصرت

میں صرف کر دیں گے۔ جب ہم مر جائیں گے اور دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو اُس وقت سمجھیں گے کہ ہم نے وفا کی اور جو ہمارا فرض تھا اُسکو ادا کر دیا"۔(۱)

امام حسینؑ نے اس طرزِ عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کسی غلط فہمی سے فائدہ اُٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے کبھی غلط توقعات قائم کر کے اپنی کاربراری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سدّباب کر کے جو حقیقی جاں نثار ہیں بس اُن کی ہمدردی کو قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی و فریب پذیری سے فائدہ نہ اُٹھائے۔

چند مختلف سبق

"واقعہ کربلا اور اُس کے عملی نتائج" اتنا طویل الذیل موضوع ہے کہ اسے دس مجلسوں میں ختم کرنا ممکن نہیں۔ واقعہ کربلا کا ہر جزئی واقعہ سرچشمہ ہے اخلاقی تعلیمات کا۔ مذہبی تعلیمات کا۔ اجتماعی تعلیمات کا۔ مظلوم کربلا نے واقعہ کربلا سے جو سبق دئے ہیں اور جس جس طرح دنیا کو اخلاق اور شائستگی کی تعلیم دی ہے اور جو گرانقدر تعلیمات پیش فرمائے ہیں، اُن پر اس مختصر وقت میں تبصرہ ممکن نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے تمام کمالاتِ انسانی کا مرقع پیش کر دیا تھا۔ اور حقیقت میں

(۱) طبری۔ ج ۶۔ صـ ۲۳۸، ۲۳۹

واقعہ کربلا ایک وہ واقعہ ہے جس میں حق و باطل کے تمام خصوصیات بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے تھے۔

یعنی اس عظیم فیصلہ کن تاریخی واقعہ کے پہلے حق و باطل کی صورتیں مشتبہ تھیں، خصوصیات نمایاں نہ تھے۔ لیکن واقعۂ کربلا کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف حق کے اندر جتنے دلفریب۔ خوش آیند۔ مستحسن خط و خال ہیں وہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے آ گئے، اور دوسری طرف باطل میں جتنی برائیاں، خرابیاں، بہیمیت و وحشت کی صفتیں ہیں، وہ سب عالم کے پیش نظر ہو گئیں۔

حسینؑ نے کربلا میں جتنے گرانقدر سبق دئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ انھیں ایسا نگاہ غلط انداز سے دیکھ کر نذر تغافل کر دیا جائے، بلکہ وہ ایسے ہیں کہ انھیں لائحۂ زندگی اور دستور العمل حیات ملی قرار دیا جائے۔

انھوں نے صلح اور رواداری کی تعلیم دی۔ امن پسندی کا سبق دیا۔ حمایت حق کا اصول بتلایا۔ استقلال اور ثبات قدم کا نمونہ دکھلایا۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جن کا تذکرہ سابق میں ہو چکا۔ اس سب کے علاوہ آپ نے یہ بھی تعلیم دی کہ کس طرح ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ احسان کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اس کے وقت پر کام آنا چاہیے، اگرچہ وہ اپنا دوست نہ ہو دشمن ہو۔ دوستوں کے ساتھ مراعات و احسان کرنا ایک معتدل الفطرت انسان کا خاصۂ مزاج ہے اور کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ

احسان کرنا، اُن لوگوں کے ساتھ سلوک نیک کرنا جو لینے سے جنگ پر تیار ہوں، اُن کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔ اُس وقت جب منزل شراف سے آگے بڑھے ہیں، حکم دیا کہ پانی مشکوں میں بھر لو اور جتنا ممکن ہو زیادہ پانی اپنے ساتھ لے لو۔ اصحاب نے تعمیل حکم کی اور پانی کثرت سے اپنے ساتھ لے لیا یہاں تک کہ حضرت اس منزل سے آگے بڑھے۔ راستہ برابر قطع ہو رہا تھا کہ سامنے سے فوج آتی ہوئی نظر آئی حضرتؑ نے راستہ اپنا بدل کر ذو حسم پہاڑی کے پاس جا کر قیام کیا۔

آتی ہوئی فوج بھی اُسی طرف متوجہ ہوئی اور تھوڑی دیر میں امام کی فوج کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ حُر کا ایک ہزار آدمیوں کا رسالہ تھا اور حضرت کے سدّ راہ ہونے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن حالت اس وقت یہ تھی کہ پیاس کا غلبہ ہو گیا تھا۔ چہرے اُداس تھے، اور راکب و مرکب شدّت عطش سے جاں بلب تھے۔ بس اب حسینؑ کے لیے دوست و دشمن کا سوال کوئی چیز نہ تھا حسین کے دل پر اس حالت کو دیکھ کر چوٹ پڑ رہی تھی اور اس سے مطلب نہ تھا کہ فریق مقابل آپ سے جنگ کے لیے آیا ہے۔ آپ کو یہ بھی پرواہ نہیں ہوئی کہ ہم کو خود اس کے بعد کس طرح کے جنگلوں میں چلنا ہو گا اور پانی دستیاب ہو گا یا نہیں حضرتؑ نے حکم دیا کہ (اسقوا القوم وارووهم من الماء ورشفوا

الخیل توشیفا۔

"ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور سیراب کردو، اوران کے گھوڑوں کو بھی پانی پلاکر سیراب کردو"۔ حسینی فوج کے نوجوان کھڑے ہو گئے اور پانی پلانے میں مصروف ہو گئے۔ تمام فوج کو مع راکب و مرکب سیراب کردیا۔ حالت یہ تھی کہ طشتوں میں، کاسوں میں، پیالوں میں پانی بھر بھر کر گھوڑوں کے پاس لیجاتے تھے اور جب ایک ایک گھوڑا پانی سے سیراب ہو کر تین، چار، پانچ مرتبہ منھ الگ کر لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لیجاتے تھے۔ یہاں تک کہ جتنے گھوڑے تھے سب کو سیراب کردیا۔

علی بن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں حُر کی فوج میں سب سے آخر میں رہ گیا تھا مجھ پر پیاس کا انتہائی غلبہ تھا حضرتؑ نے جو میری اور میرے گھوڑے کی پیاس دیکھی تو فرمایا۔ (انخ الراویۃ۔ "راویہ کو بٹھالے"۔ (راویہ شتر آب کش کو کہتے ہیں) یہ شخص عراق کا رہنے والا تھا۔ وہ راویہ کے معنی مشک کے سمجھتا تھا اسلیے کچھ معنی اُس کی سمجھ میں نہ آئے حضرت نے فرمایا۔ یا ابن اخی انخ الجمل۔ یہ مہربانی ہے یہ ملائمت ہے۔ مخاطب بظاہر تو عمر آدمی تھا، اُسے بیٹا بھتیجا فرما کر خطاب کر رہے ہیں۔ "میرے بھائی کے فرزند جمل (اونٹ) کو بٹھا"۔ اُس نے اونٹ کو بٹھا دیا حضرت نے فرمایا "پیو۔ پانی پیو"۔ راوی کا بیان ہے کہ میں اتنا بدحواس تھا پیاس کی وجہ سے کہ جب پانی پینا چاہتا تھا پانی بہنے لگتا تھا

کسی طرح میرے منھ میں نہ جاتا تھا۔ حضرت نے فرمایا "مشک کو اپنی طرف موڑ لے" میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں کس طرح سے پانی پیوں۔ تب حضرتؑ خود اپنی جگہ سے اٹھے اور قریب تشریف لا کر اپنے ہاتھ سے مشک کے دہانہ کو درست فرمایا اور جب میں اور میرا گھوڑا سیراب ہو لیے تب حضرت تشریف لیگئے

یہ بھی اخلاقی تعلیم۔ یہ بھی حسینی تعلیم۔ اس طرح بتایا کہ کس طرح دشمنوں کے ساتھ انسان کو حسن سلوک کرنا چاہیے۔ کس طرح دشمن کی بھی امداد کرنا چاہیے جہاں تک اُس کی امداد سے حمایت باطل نہ ہو۔

شخصی وانفرادی حیثیت سے کافر بھی ہو تو اُس کی مدد کرنا چاہیے مگر اُس کے کفر میں امداد نہ کرے اور حمایت باطل کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ تو دشمنوں کے ساتھ حضرتؑ کے حسن سلوک کا نمونہ تھا۔ دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے، اور اپنوں میں کس طرح انسان کو مساوات مد نظر رکھنا چاہیے۔ اس کا بھی بہترین سبق امام حسینؑ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قبل کے واقعات کا تذکرہ اہم نہیں ہے اس لیے کہ سفر سہی، مگر اطمینان کا وقت تھا۔ امن وسکون کا دور تھا۔ کوئی ایسی سخت صورت حال نہ تھی مگر عاشورہ کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا اُس وقت حسینؑ نے کس طرح سے حقوق کا لحاظ کیا ہے۔ کس طرح یہ خیال رکھا ہے کہ جانبداری اور کسی خاص پاسداری کا پہلو پیدا نہ ہونے پائے۔ عزیز بھی تھے اور غیر بھی

تھے، مگر آپ کا طرزِ عمل سب کے ساتھ مساوی تھا۔ کسی طرح کی خصوصیت جو عزیزوں کے ساتھ ہو وہ غیروں کے ساتھ نہ برتی گئی ہو! ناممکن ہے۔ جو شہید گھوڑے سے گرا حضرت خود تشریف لے گئے۔ کوئی تخصیص نہیں۔ آزاد بھی تھے اور غلام بھی تھے۔ قریش بھی تھے اور غیر قریش بھی۔ ہاشمی بھی تھے اور غیر ہاشمی بھی۔ اپنے دل کے ٹکڑے بھی تھے اور اغیار بھی۔ مگر سب کے ساتھ یکساں برتاؤ۔ متحدہ طرزِ عمل، کہیں تفریق نہیں چاہے اُس میں خود حضرت کے نفس کو کتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی ہو۔

جنگ کے میدان میں اور خیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ جو شہید جنگ کیلیے جاتا تھا وہ میدان میں لڑتا اور وہیں شہید ہو کر گرتا تھا۔ اب ملاحظہ فرمایئے۔ امام کا تعب۔ امام کی تکلیف حضرتؑ کو ہر شہید کی لاش پر جانا اور پھر اُس کی لاش لے کر واپس آنا۔ اس طرح اکثر دفعہ اس طویل مسافت کو طے کرنا جانا اور پھر واپس ہونا۔ اُس دھوپ میں، اُس گرمی میں۔ اُس تمازت آفتاب میں اتنی تکلیف، اتنی زحمت، اتنی مشقت برداشت کی، مگر یہ نہیں ہوا کہ کسی شہید راہ خدا کے حق میں کوتاہی ہو جاتی۔

نہیں سب کے ساتھ عزیزوں کا سا برتاؤ جو آتا تھا اجازت مانگتا تھا تو اُسے دیکھتے بھی اجازت دیتے تھے۔ جب تک وہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اُس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے۔ جب گرتا تھا تو فوراً لاش پر پہونچتے تھے۔

اس طرح یہ بتایا کہ کس طرح ایک سردار۔ ایک رئیس۔ ایک افسر کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مساوات اور یگانگی کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟ ایک سرگروہ کا فرض کیا ہے۔ اُسے اپنے ساتھ جان صرف کرنے والوں کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کرنا چاہیے؟

مجھے معلوم ہے اصحاب اتنے باوفا تھے کہ اگر یہ طرزِ عمل نہ بھی ہوتا تب بھی اُن کے ارادوں میں تزلزل نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اس برتاؤ کے غلام بن کر جان نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ ایک اصول کے تحت میں اپنی جان قربان کر رہے تھے۔ لیکن یہ آپ کی فرض شناسی تھی۔ یہ آپ کی اخلاقی تعلیم تھی۔

اس وقت تک حقوق الناس کا تذکرہ تھا۔ اب حقوق اللہ کی مراعات ملاحظہ ہو۔ خدا کے ساتھ ایک بندہ کا جو واسطہ ہوتا ہے اُس کا کس حد تک امامؑ نے خیال کیا اور کس طرح امام کے ساتھیوں نے اُس کا خیال رکھا۔

ایک شب کی مہلت مانگی اور وہ بمشکل ملی۔ ایک دنیا سے جانے کے اوپر تیار انسان، اُس کے دل میں کیا کیا تمنائیں ہوتی ہیں۔ امامؑ نے ایک شب کی مہلت لی۔ کیا اعزا سے ملنے کے لیے کیا۔ اس لیے کہ ایک شب اہل حرم کو جی بھر کر دیکھ لیں۔ اپنے بعد کے متعلق ہدایتیں کر دیں؟ نہیں یہ کچھ نہیں بلکہ صرف خدا کی عبادت کے لیے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا ضحاک ابن عبداللہ مشرفی ناقل ہیں۔ فلما امسیٰ

حسین واصحابہ قاموا اللیل کلہ یصلون ویستغفرون ویدعون ویتضرعون ۔ جب شام ہوئی تو امامؑ اور آپ کے اصحاب نے تمام رات گذاری کھڑے کھڑے نماز کی حالت میں، دعا اور استغفار اور تضرع کی حالت میں (۱)۔

ابھی پھر بھی آسان تھا ۔ مگر وہ وقت کہ جب عاشور کے قیامت خیز دن کی ظہر کا وقت آچکا ہے، موت کا بازار گرم ہے ۔ اصحاب میں بہت آدمی شہید ہو چکے ہیں ۔ مسلم بن عوسجہ ۔ عبداللہ بن عمیر ۔ بریر بن خضیر ۔ عمرو بن قرظہ، نافع بن ہلال وغیرہ امام کا ساتھ چھوڑ کے راہی جنت ہو گئے ہیں ۔ نماز ظہر کا وقت آیا ۔ ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی حاضر خدمت امام ہوئے، اور عرض کی ۔ یا اباعبد اللہ نفسی لک الفداء انی اری ھؤلاء قد اقتربوا منک ولا واللہ لا تقتل حتی اقتل دونک ان شاء اللہ واحب ان القی ربی وقد صلیت ھذہ الصلوٰۃ التی قد دنا وقتھا

"یا اباعبداللہ میری جان آپ پر نثار ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ آپ کے بہت قریب آگئے ہیں لیکن خدا کی قسم آپ پر کوئی آنچ نہیں آسکتی جب تک میں آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خدا کے یہاں جو جاؤں تو یہ نماز آپ کی معیت میں پڑھ کر جس کا وقت قریب آگیا ہے"۔

امام حسینؑ نے اپنا سر اٹھایا ۔ فرمایا ۔ ذکرت الصلوٰۃ جعلک اللہ

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۰

من المصلین الذاکرین نعم ھذا اوّل وقتھا۔

"تم نے اس وقت میں بھی نماز کو یاد رکھا۔ خدا تم کو نماز گذاروں اور نماز کے یاد رکھنے والوں میں محسوب فرمائے۔ ہاں یہ تو اوّل وقت ہے نماز کا۔"

پھر فرمایا "ان سے کہو اتنی مہلت دیدیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔"

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مہلت نہیں ملی اور دشمن کی فوج نے جنگ سے ہاتھ نہیں روکا۔ حصین بن تمیم نے مہلت نماز کی خواہش پر یہ جواب دیا تھا لاتقبل۔ جس پر حبیب بن مظاہر کو غصہ آگیا اور کہا "نماز قبول نہ ہوگی؟ ارے تیری نماز قبول ہو اور آل رسولؐ کی نماز قبول نہ ہو؟!!" حصین بن تمیم نے حملہ کردیا، اور حبیب بن مظاہر نے اس سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کو زخمی کردیا اور لوگ اس کو حبیب کے ہاتھ سے چھڑا کر لشکر میں لے گئے۔ حبیب نے جوش میں رجز پڑھا

اقسم لو کنّا لکم اعدادا　　او شطرکم ولّیتم اکتادا

یا شرّ قوم حسبا و اٰدا

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہماری تعداد تمہاری اتنی ہوتی یا تمہاری تعداد کی نصف بھی ہوتی تو تم میں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہ رہتا۔ اور میدان جنگ صاف نظر آتا۔"

اس رجز کے بعد شاید یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ہماری قلت تعداد کو ہماری کمزوری کی دلیل نہ سمجھا جائے اسلیے دوسرا رجز پڑھنے لگے۔

انا حبیب وابی مظاہر فارس ہیجاء وحرب تسعر

انتم اعد عدۃ واکثر ونحن اوفی منکم واصبر

ونحن اعلی حجۃ واظہر حقا واتقی منکم واعذر

"میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر ہے شہسوار ہوں میدان جنگ کا۔ ایسی جنگ کا جس کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ تم بیشک تعداد میں زیادہ ہو اور بہت ہو مگر یاد رکھنا کہ ہم وفا میں تم سے زیادہ اور صبر و استقامت میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز (تمھاری تعداد زیادہ ہو تو ہو) ہم حق پر ہیں ہماری حجت تم سے زیادہ قوی اور روشن اور ہمارا تقویٰ مستند اور ہماری حجت تمام ہے۔"

اس سے حبیب نے اکثریت کے عام معیار حقیت کو باطل کیا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ کثرت دلیل حقانیت نہیں ہے نصرت ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہماری شکست بھی فتح اور ہمارا انجام دائمی زندگی ہے" آپ نے بہت سخت جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

میری جہاں تک سمجھ میں آتا ہے، دشمن نے جنگ کو ملتوی نہیں کیا۔ مگر کیا کہنا اصحاب حسینؑ کی فرض شناسی اور عبادت الٰہی کے ذوق و شوق کا۔ وہ بھی ایک اتمام حجت تھی جو جنگ روکنے کی خواہش کی تھی، مگر جب جنگ نہیں رکی تو ثابت کر دیا کہ ہم جنگ رکنے کے محتاج نہیں ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے بھی اس کا

عملی سبق دیا تھا۔ جنگ صفین میں آپ کا مصلیٰ دونوں صفوں کے درمیان بچھا دیا گیا تھا۔ ابن عباس نے کہا تھا کہ یہ وقت نماز کا ہے؟ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ "اسی نماز کیلئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں"۔

ائمہ معصومینؑ نے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اگر حقیقی محبت کوئی ہمارے ساتھ رکھتا ہے تو اس کو ان فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے۔

امام حسینؑ نے ایسے سخت ترین موقع پر جب دنیا کا کوئی شخص مطمئن نہیں رہ سکتا تھا جب کہ کسی شخص کو فرائض کا احساس باقی نہیں رہ سکتا تھا ان فرائض کو ادا کر کے یہ سبق دیدیا کہ چاہے کیسا ہی سخت موقع پڑے لیکن فرض شناسی سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

صلوٰۃ خوف کی صورت سے نماز ادا کی۔ دو جاں نثاروں کو سامنے کھڑا کیا۔ ایک سعید بن عبداللہ حنفی اور دوسرے زہیر بن القین۔ جو تیر آتا تھا دونوں بزرگوار اپنے اوپر روکتے تھے معلوم ہوتا ہے میدان جنگ قبلہ رخ تھا۔ اگر قبلہ سے علحدہ ہوتا تو امام مصلّے پر ہوتے اور جماعت پیچھے۔ امام کے سامنے کھڑے ہونے والے دو آدمی۔ آپ کا بچاؤ کر لیتے لیکن پوری جماعت دشمنوں کے تیروں کے مقابل ہوتی۔ امام کو یہ گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ دوسرے لوگ تیروں کا نشانہ ہوں اور آپ بچ جائیں۔ لیکن جب میدان جنگ قبلہ کے رخ پر ہو تو آگے رہے امام اور پیچھے مجاہدین کی صف نماز۔ دو آدمی بھی جو امام کے سامنے کھڑے ہو گئے تو صرف امام کا نہیں تمام جماعت کا بچاؤ ہو گیا اور اس طرح نماز ادا کی گئی۔ ادھر نماز ختم ہوئی ایک آدمی ان دو جاں نثاروں میں سے

یعنی سعید بن عبداللہ تیروں سے مجروح ہو کر زمین پر گر پڑا اور دنیا سے رخصت ہوا کیا کہنا اس نماز کا اور کیا کہنا ان مجاہدین کے ادائے فرض و ادائے حق و فا کا۔
اب اصحاب نے شوق شہادت میں جانیں دینا شروع کیں۔ امام حسینؑ اُسی طرح اپنے فرائض و رب کے حقوق ادا کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی باقی نہیں رہا۔ سب شہید ہو گئے اعزا کی باری آئی۔

تاریخ نے سب واقعات کو بیان بھی کہاں کیا ہے۔ اس لیے کہ دوست باقی بچے نہیں تھے۔ دشمنوں کو غرض کیا تھی کہ تمام واقعات بیان کرتے۔ یقیناً اگر موقع ہوتا تو حضرتؑ اعزا کو اصحاب سے پہلے میدان جنگ جانے کی اجازت دیتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا کہ اُن کی زندگی میں کوئی شخص اولاد ہاشم سے میدان جنگ میں جائے۔ مگر جب اصحاب شہید ہو چکے اور دل کے ٹکڑوں کی نوبت آئی تو اب بھائی کی اولاد تھی یعنی امام حسنؑ کے صاحبزادے۔ چچا زاد بھائی کی اولاد یعنی مسلم کے فرزند۔ چچا کے بیٹے یعنی عقیل کی اولاد۔ پھر ایک چچا زاد بھائی کے بیٹے یعنی عبداللہ بن جعفر کے صاحبزادے جو بھانجے کہے جاتے ہیں اپنے باپ کی اولاد یعنی بھائی اور خود اپنی اولاد۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ کوئی اور میدان جنگ میں نہ جانے پائے اور یہ کہنے کو نہ ہو کہ بھائی کی اولاد تھی نا اسلئے اُسے پہلے بھیجدیا یا چچا کی اولاد کو پہلے بھیجدیا۔ اس لیے تاریخ کی مسلمہ حقیقت یہ ہے۔ حدیث اور تاریخ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اعزا میں سب سے پہلے جناب علی اکبر کو میدان جنگ میں جانے کی

اجازت ملی ہے۔ حدیث کلام معصوم کا نام ہے۔ کلام معصوم یعنی زیارت میں جو جناب علیؑ اکبر کے لیے وارد ہے صاف طور سے پہلا فقرہ یہ ہے کہ السلام علیک یا اوّل قتیل من نسل خیر سلیل من سلالۃ ابراہیم الخلیل۔

"سلام ہو آپ پر اے سب سے پہلے شہید ہونے والے، نسل سے بہترین شخص کی اولاد ابراہیم خلیل خدا میں سے۔"

تاریخ کی حیثیت سے طبری کی تاریخ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

کان اوّل قتیل من بنی ابی طالب یومئذ علی الاکبر بن الحسین بن علی و امہ لیلیٰ ابنۃ ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود الثقفی۔

"سب سے پہلے مقتول اس دن ابو طالب کی اولاد میں علی اکبر ہیں جو حسینؑ کے فرزند تھے اور آپ کی والدہ اُم لیلیٰ تھیں جو ابو مرۃ ابن عروہ بن مسعود ثقفی کی بیٹی تھیں۔" آپ نے جب حملہ کیا تو یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا علی بن حسین بن علی   نحن و رب البیت اولیٰ بالنبی

تاللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

دیکھیے یہ رجز بھی تبلیغی رجز ہے۔ اس میں حمایت حق کے جذبہ کا اظہار ہے۔

"میں ہوں علی، حسین بن علیؑ کا فرزند۔ ہم خانۂ کعبہ کے پروردگار کی قسم نبی کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

خدا کی قسم زنا زادہ کی اولاد ہمارا حاکم نہیں ہو سکتی۔"(۱)

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۶

امام حسینؑ کو یہ دکھلانا تھا کہ حمایت حق کے موقع پر سب سے زیادہ اپنے عزیز ترین شخص ہی کو فدا کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ جو اپنے سے قریبی تعلق رکھتا تھا اُس کو سب سے آگے بھیجدیا۔ وہی رسالتمآبؐ کا طرزِ عمل جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ جب جنگ کا موقع ہوتا تھا، آپ اپنے خاص عزیزوں کو آگے رکھتے تھے۔ چنانچہ عبیدہ جنگ بدر میں شہید ہوئے اور حمزہ جنگ احد میں۔ اسی طرح امیرالمومنینؑ نے جنگ جمل میں علم لشکر اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو دیا اور فوج دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا، اور اسی کا مکمل نمونہ امام حسینؑ نے کربلا میں پیش کیا کہ سب سے پہلے اپنے فرزند کو اجازت دیدی۔ جب وہ شہید ہو گئے تو پھر اور اعزّا میدان جنگ میں گئے۔ طبری میں جناب علی اکبرؑ کے بعد جناب قاسمؑ کی شہادت کا تذکرہ ہے۔ یقیناً علی اکبرؑ کے بعد سب سے زیادہ محبوب حضرت کو قاسم ہی ہونگے۔ اسی لیے علی اکبرؑ کے بعد قاسمؑ کو میدان جنگ میں روانہ فرمایا۔

جناب عباسؑ وہ امام حسینؑ کی اطاعت کے بڑے پابند تھے جو حسینؑ کی سیرت تھی وہی جناب عباسؑ کی۔ میں نے جس طرح امامؑ کے متعلق عرض کیا تھا کہ امام نے سب کو اپنے سامنے میدان جنگ میں بھیجدیا تاکہ سب کی مصیبت آپ برداشت کریں۔ اس کے بعد اپنی جان دیدینا تو آسان ہے۔ وہی جناب عباسؑ نے بھی کیا۔

تین بھائی جناب عباسؑ کے حقیقی یعنی ام البنین کے بطن سے تھے عبداللہ

جعفر عثمان۔ جناب عباس نے ان سب کو اپنے پہلے میدان جنگ میں بھیجا
اور کہا۔ تقدموا بنفسی انتم فحاموا عن سید کم حتی
تموتوا دونہ

"میری جان تم پر سے فدا۔ تم آگے بڑھو اور اپنے سید و سردار
(حسینؑ) کی حمایت کرو یہاں تک کہ اُن کے قدموں پر جان نثار کر دو"
وہ تینوں جوان آگے بڑھے اور حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر دشمنوں
کے حربے روکنے لگے اور جنگ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تینوں شہید ہو گئے۔ (۱)
جب عباس نے اپنے بھائیوں کو امام کے سامنے شہید ہوتے دیکھ لیا
تب خود امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اذن جہاد طلب کیا۔
جناب عباس یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ دوسرے عزیز آپ سے پہلے میدان
جنگ میں جا کر شہید ہو جائیں۔ مگر آپ علمبردار تھے۔ آپ کو اپنی ذمہ داری کا
احساس تھا اور آپ سمجھتے تھے کہ علم فوج کا نشان ہے۔ اور وہ جب تک
قائم ہے اُس وقت تک وقار و عزت کا قیام ہے۔ اس لیے اب تک
سب کے مصائب برداشت کیے تھے، اور خود خاموش رہے تھے۔ مگر
اب جب کہ سب شہید ہو گئے اور کوئی باقی نہ رہا تو اُس وقت آپ کو حاضر
خدمت ہونا پڑا، اور عرض کیا۔ "اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔" حسینؑ

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۵۵

نے بھی وہی کہا کہ "تم علمدار ہو" مگر عباس نے عرض کیا "اب فوج کہاں ہے جسکا میں علمدار تھا"۔ اب تو بس سردار ہے اور علمدار اور یہ ظاہر ہے کہ علمدار کی حیثیت کتنی ہی اہم ہو لیکن سردار کے برابر نہیں ہے۔

یہ اطمینان قلب کی دلیل ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ موقع کس بات کا ہے۔ جذبات کی رو میں کوئی اقدام نہیں ہے۔ ہر ایک بات آئین کے مطابق۔ اصول کے موافق۔ کون پہلے جائے؟ کس کے پہلے جانے میں کیا پہلو پیدا ہوتا ہے؟

سلسلۂ شہدا میں سب سے پہلے اصحاب اور عزیزوں میں سب سے پہلے علی اکبر اور آخر میں جناب عباس۔ اسکے بعد فوج کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر جو قربانیاں ہوئی ہیں وہ بے بسی کی ہیں۔ اس طرح امام حسینؑ نے میدان کربلا میں تعلیمی پہلو کو مد نظر رکھا۔

واقعۂ کربلا میں صرف مصائب ہی نہیں ہیں جو دلدوز ہونے کی حیثیت سے فطرت انسانی کو اشک افشانی کی دعوت دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اسکے ساتھ ساتھ مدرسۂ تربیت ہے جہاں دنیا کو اخلاق، ادب، فرائض شناسی کے اصول بتلائے گئے ہیں

مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سے (جس طرح اس کے دلدوز پہلو سے اثر لیتے ہیں۔ اسی طرح اسکی درسگاہی حیثیت سے) سبق حاصل کریں۔ اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

⟵ ⟸ ﴿ ختم ﴾ ⟹ ⟶

امامیہ مشن کی ممبری قبول فرما کر ناصرین اہلبیت علیہم السلام کی فہرست میں اپنا نام بھی درج فرمائیے

چندہ لائف ممبری	کم از کم پچاس روپیہ یکمشت
چندہ ممبران خصوصی	پانچ روپیہ سالانہ
چندہ ممبران عمومی	ایک روپیہ سالانہ

(نوٹ)

لائف ممبران کی خدمت میں گذشتہ اور آئندہ کے تمام رسائل بلا طلب بلا قیمت ارسال ہوں گے۔

ممبران خصوصی کو ممبر بننے کے بعد تمام رسائل بلا طلب و بلا قیمت ارسال ہوں گے اور قبل کے رسائل اگر خریدنا چاہیں گے تو صرف نصف قیمت چارج کیجائے گی۔

ممبران عمومی کو ممبر بننے کے بعد شائع ہونے والے رسائل (بشرطیکہ وہ طلب فرمائیں) نصف قیمت پر دیئے جائیں گے اور سابق کے رسائل اگر خریدنا چاہیں گے پوری قیمت چارج کیجائے گی۔

(الداعی الی الخیر)

سید ابن حسین آنریری سکریٹری امامیہ مشن

عجائبات

اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جو عالم اسلامی میں ظاہر ہوئی ہے سنہ ۱۳۵۳ھ
میں مشاہد مشرفہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے جو حیرت انگیز مظاہر قدرت
یعنی معجزات ظاہر ہوئے ان کے مستند تفصیلی واقعات اسمیں شایع کئے
گئے ہیں جو ارباب ایمانی کے لئے بصیرت افروز اور تمام مذاہب واقوام
کے مقابل صداقت وحقانیت کی دلیل ہیں۔ یہ کتاب حضرت سید العلماء
دام ظلہ کا نتیجہ قلم اور انہی کی ذاتی تحقیقات اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ تقطیع
۲۰×۲۶ کاغذ سفید چکنا قیمت صرف ایک روپیہ اور خرچہ ڈاک ۹ پیسہ۔

وجیزۃ الاحکام

عرصہ سے اس ضرورت کا احساس کیا جا رہا تھا کہ حضرت سید
العلماء دام ظلہ کے فتاویٰ اور ضروری مسائل فقہ کا مجموعہ شایع
کیا جاوے۔ چنانچہ سردست یہ مختصر اور اہم مسائل کا مجموعہ شایع کیا گیا ہے
انشاء اللہ آئندہ ایک مبسوط کتاب مسائل فقہ میں جو تمام ابواب فقہ
کی جامع ہوگی شایع کی جائے گی۔ قیمت فی جلد چار آنے اور خرچہ ڈاک ۲ر

ملنے کا پتہ

سید ابن حسین سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

امامیہ مشن کے تبلیغی رسالے

نمبر	نام رسالہ	ایڈیشن	قیمت	خرچ ڈاک
۱	تماشایان حسینؑ کا مذہب	(تیسرا ایڈیشن)	۴ر	
۲	تحریف قرآن کی حقیقت	(دوسرا ایڈیشن)	〃 ۶/	
۳	مولود کعبہ	〃	〃 ار	〃
۴	وجود حجت	〃	〃 ۴ر	〃
۵	اصول دین اور قرآن	〃	〃 ۴ر	〃
۶	اتحاد الفریقین حصہ اول		〃 ۴ر	〃
۷	حسینؑ اور اسلام اردو	(تیسرا ایڈیشن)	〃 ۱ر	〃
۸	〃 ہندی		〃 ۱۰ر	[illegible]
۹	〃 انگریزی		〃 ۱۲ر	〃
۱۰	متعہ اور اسلام		〃 ۸ر	[illegible]
۱۱	امامت آئمہ اثنا عشر اور قرآن	(دوسرا ایڈیشن)	〃 ۱۰ر	[illegible]
۱۲	تجارت اور اسلام		〃 ۳ر	[illegible]
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم		〃 ۴ر	[illegible]
۱۴	علیؑ اور کعبہ		〃 ار	[illegible]
۱۵	رجال بخاری حصہ اول		〃 ۱۶ر	[illegible]
۱۶	مذہب باب و بہار حصہ اول		〃 ۵ر	[illegible]
۱۷	نوروز و غدیر	(دوسرا ایڈیشن)	〃 ار	[illegible]
۱۸	مجاہدۂ کربلا		〃 ۲ر	[illegible]
۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی)		〃 ۲ر	[illegible]
۲۰	دی مارٹیرڈم آف حسینؑ (انگریزی)		〃 ۲ر	[illegible]
۲۱	اسوۂ حسینی		〃 ۷ر	[illegible]
۲۲	جنگ صفین		〃 ۱۳ر	[illegible]

المشتہر:۔ آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ